بدلتے قالب

اکرام اللہ

بدلتے قالب

اکرام اللہ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۲ء

نیاز احمد نے
زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ایک ہزار
قیمت ۷۵/۰۰ روپے

ترتیب

سب راتوں جیسی رات

صاف ستھرے ستارے سیاہ آسمان پر ٹکے دمک رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی اس طرح چھائی تھی جیسے اس کرہ ارض پر کبھی کوئی آواز پیدا ہی نہیں ہوئی۔ چھت کے اوپر ایک کونے میں ریت سے بھری بوریوں کا ایک دائرہ تقریباً چھ فٹ اونچی پردہ دیوار تک اٹھتا چلا گیا تھا۔اور اس کے درمیان میں مورچہ لگائے، بندوق کی نالی دیوار کے سوراخ میں سے باہر سڑک کی طرف نکالے وہ اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے سر سے اوپر ایک ایک فٹ تک بوریوں کا دائرہ چکر کھا گیا تھا۔اس کے برابر چھت کے دوسرے کونے پر اس کی بیوی اسی طرح کے مورچے میں دبکی سڑک پر تاک لگائے بیٹھی تھی۔مکان کے عقبی حصے کی نگہداشت کے لئے اس کا بیٹا اور بیٹی چھت کے دوسرے کونوں پر مورچوں میں اپنی بندوقیں سنبھالے بیٹھے تھے۔اس لمبی چوڑی چھت کے عین درمیان میں ایک چوکور کمرہ ہے جو در اصل کمرہ نہیں بلکہ مکان کے اندر وسط میں سے بل کھا کے اوپر آتی ہوئی سیڑھیوں کے اوپر چھت کا اہتمام ہے۔یکدم ایک جھینگر کہیں چیخ پڑا۔وہ جو اطمینان سے جمائی لے رہا تھا ہڑ بڑا کے بندوق کی طرف جھکا۔ اس کی بیوی کے منہ سے دھیمی سی آواز میں بے ساختہ نکلا یہ 'کون۔ لیکن کون نکلنے سے پہلے وہ محسوس کر چکی تھی کہ وہ بلا وجہ ڈر گئی ہے۔وہ سنبھل چکا تھا۔ آواز میں غیر ضروری طنز پیدا کرتے ہوئے بولا "جھینگر اور کون۔" اس کی بیوی نے خفت سے کوئی جواب نہ دیا۔ جھینگر گائے جا رہا تھا۔ایک لے، ایک تال میں اور سکوت

کے سمندر میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہا تھا' ایک رومانی سی اداسی بکھیر رہا تھا۔اس کی آواز جو اپنے میت کو بلا رہی تھی' پکار رہی تھی یا محض کسی بے وفا ساتھی کی یاد میں ابھر رہی تھی انہیں اچھی لگ رہی تھی۔ ان کی پھیکی' سراپا انتظار زندگیوں میں ایک کھیل' ایک چھوٹا سا ڈرامہ دیکھنے کا لطف پیدا کر رہی تھی۔اس نے بوریوں سے ٹیک لگا کے' سامنے بوریوں پر ٹانگیں پھیلا لیں اور اعلان کیا "میں سونے لگا ہوں۔" اپنے سے آڑے کونے پر بیٹھی ہوئی بیٹی سے کہا۔"تو بھی سو جا' ہم اٹھیں گے تو تیرا بھائی اور اماں سولیں گے۔"

اس کی بیوی بولی۔" سنو! ننھا دودھ پیتے پیتے سو گیا ہے میں ابھی اس کے ساتھ ہی سولیتی ہوں۔پھر یہ اٹھ گیا تو میں سو نہ سکوں گی۔"

اس نے پھیلی ہوئی ٹانگیں بوریوں پر سے سمیٹتے ہوئے کہا۔"کیا مصیبت ہے۔ اچھا بہانہ ہے یہ بھی۔"

اس نے سوراخ میں سے نظر گھما کے دیکھا۔سڑک کا لیٹا ہوا خاموش سایہ' اندھیرا' ادھر ادھر کھڑے سیاہی میں لپٹے درختوں کے بھوت اور جھینگر کی آواز۔اس کے مورچے میں سے روشنی کا ایک چھلاوا سا ابھرا' پل بھر کے لئے چھت منور ہو گئی۔اس کے پیچھے سیڑھیوں کا دروازہ منہ کھولے کھڑا تھا۔اس کی بیوی گرجی۔"کیا کرتے ہو تم۔" اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا "ورنہ میں سو جاتا' فکر نہ کر چھپا کر پیوں گا۔تم سو جاؤ۔"

"سیڑھیوں میں جا کر سلگا لاتے' اب اگر اسی شعلے پر گولی آتی تو پھر؟"

"چلو اب تو ہو گیا۔"

اس نے ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ کے پھر بوریوں سے ٹیک لگا لی اور سامنے بے انتہا' بے شمار چھوٹے بڑے ستارے' کھلے پڑتے' تھے۔یہ چمک رہے ہیں اور ایک تار چمکے جا رہے ہیں۔مجھ سے کس قدر بے نیاز۔میرے دکھ' میری تکلیفیں' میری الجھنیں' میری اپنے وجود کے اندر پھڑ پھڑاہٹ' تلملاہٹ جو مجھے اس میں سے اڑا کر کہیں لے جانا چاہتی ہے لیکن بے بس ہے۔یہ سب کچھ ان پر کسی طرح منعکس نہیں ہوتا؟ اس نے سر اٹھا کر تینوں مورچوں پر نظر دوڑائی۔ ریت کی بوریوں کے دائرے خاموش کھڑے تھے۔یہ سب کچھ تو میں ان تین مورچوں تک بھی منعکس نہیں

کر سکتا۔جو کچھ ان کی دنیائیں ہیں مجھے ان کی کوئی خبر نہیں۔نہ انہیں ایک دوسرے کی دنیاؤں کی خبر ہے نہ کبھی ہو گی۔سب الگ الگ ' بالکل تنہا ' ستاروں کی طرح صرف اپنے اپنے محور کے گرد گھومنے والے اور ان میں ایک واجبی سی مطابقت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ـــــ دشمن۔اس نے ایک اچٹتی سی نظر گھمائی۔ہولے سے کہا مردہ ڈھیر تین مردہ ڈھیر ' نہیں چار مردہ ڈھیر۔میرا اور ستاروں کا محض اتنا تعلق ہے کہ وہ چمکیں اور میں دیکھوں ؟ اگر میں نہ دیکھوں وہ تو پھر بھی چمکتے رہتے ہیں - اسی طرح ایک تار۔یہ تو کوئی تعلق نہیں - یک طرفہ تعلق بھی کوئی تعلق ہوتا ہے - نور کی دھند کی سڑک آسمان کے ایک کنارے سے نکل کر دوسرے کنارے تک بڑھتی چلی گئی تھی - جب میں اور میرا دشمن نہیں تھے تب بھی یہ غبار اڑاتی سڑک اسی طرح ہو گی جب میں اور میرا دشمن نہیں ہوں گے تب بھی یہ اسی طرح غبار اڑا رہی ہو گی۔میں اور میرا دشمن تو کیا ابھی زندگی کا پہلا خلیہ بھی پیدا نہیں ہوا تھا تب بھی یہ اسی طرح غبار اڑا رہی تھی - یوں لگتا ہے ہے کہ صرف لحظہ بھر پہلے سوار گزرا ہے۔حالانکہ اسے گزرے کھربوں صدیاں ہو چکی ہوں گی ' وہاں شاید لحظہ ہی گزرا ہے یا شاید اتنا بھی نہیں کیونکہ دھول ابھی اوپر کی جانب پوری طرح اٹھ نہیں سکی۔واپسی کا عمل تو بہت بعد میں شروع ہو گا۔وقت جو اتنا پہلو دار ہے کائنات جو اتنی لا انتہا ہے ' اس میں ' میں اور میرا دشمن صحرا میں پڑی ریت کے دو ذروں سے بھی زیادہ حقیر ' ایک غیر واضح دشمنی کے سہارے اپنے آپ کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کی لایعنی کوشش میں مصروف۔ٹشوں ں ں ں - ایک گولی اگر ابھی دشمن چلا دے تو میں اتنی لمبی چوڑی سوچیں بھول کر ایک دم اپنی چھوٹی سی مگر حد درجہ کمینی دنیا میں واپس آ کر دشمن سے برسرپیکار ہو جاؤں گا۔میری کتنی دنیائیں ہیں ' میں اور دشمن ' میں اور وقت ' میں اور کائنات ' میں اور گھر ' میں اور میرا خاندان ' میں اور میں اور آخر میں میں اور کچھ بھی نہیں یا کچھ بھی نہیں اور میں - یہ تو در اصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ان کا آگا پیچھا اور الٹا سیدھا کچھ نہیں ہوتا۔جھینگر خاموش ہو گیا تھا تمنا کے واہموں کے پیچھے رونے اور گانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے ' تھک ہار کر آخر صبر آ ہی جاتا ہے ' نہیں آتا تو ہمارے انتظار کو صبر نہیں آتا ' ہم کب سے منتظر ہیں کہ دشمن اب آئے گا لیکن وہ آ بھی نہیں چکتا اور نہ ہی یہ کہتا ہے کہ نہیں آؤں گا۔اس کے انتظار میں

ہم نے تپتے ہوئے دن اور ٹھٹھرتی ہوئی راتیں اپنے سروں پہ جھیلی ہیں جس طرح وہ ہمارے دلوں ' دماغوں اور ذہنوں میں بسا ہوا ہے اور جس طرح ہم کوئی لمحہ اس کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔اس طرح تو اس کے کسی چاہنے والے نے بھی اسے یاد نہیں کیا ہو گا۔اپنے دل میں بسایا نہیں ہو گا۔یہ لڑکا' میرا بیٹا آخر بچہ ہی تو ہے' کہیں اونگھ نہ گیا ہو' اس سے باتیں کرتے رہنا چاہیے۔

" بیٹا نیند تو نہیں آئی ؟"

" نہیں بابا۔" " تھوڑی تھوڑی دیر سے سوراخ سے جھانکتے رہنا۔"

" ابھی دیکھا ہے۔سب ٹھیک ہے ' فکر نہ کریں۔"

" بابا!"

" ہاں۔"

" دشمن ہم پر کب حملہ کرے گا ؟"

" خدا نہ کرے کہ دشمن ہم پر حملہ آور ہو ' وہ نازک گھڑی کبھی نہ آئے۔ایسی باتیں نہیں سوچا کرتے۔"

" بابا ہم ہر وقت یہی تو سوچا کرتے ہیں کہ وہ اگر سامنے سے آئے گا تو ہم چاروں آپ کے اور امی کے مورچوں میں اکٹھے ہو کر لڑیں گے۔اگر دشمن پسپا نہ ہوا تو آپ نیچے جا کر دیوار پھاند کر باہر جائیں گے اور دشمن کے پیچھے سے حملہ آور ہوں گے ' اگر پھر بھی کامیابی نہ ہوئی تو ننھے اور دادی اماں کو گولی مار کر ہم تینوں بھی کھلے میں ان کے سامنے آ کر سٹین گنوں سے ان پر گولیاں برسائیں گے اور اگر اس نے عقب سے حملہ کیا ....."

" وہ تو ٹھیک ہے میرا کہنے کا مطلب صرف یہ تھا کہ اس طرح ہر وقت سوچتے رہنے سے خوف پیدا ہونے کا امکان ہے جو بزدلی کو جنم دیتا ہے "

"خوف ' بزدلی۔ میں تو چاہتا ہوں کہ دشمن ابھی آ جائے اور اسی وقت اس سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ میں نے بندوق سیکھنے ' نشانہ پکانے میں کتنی گولیاں چلائی ہیں ؟ کتنا وقت صرف کیا ہے ؟ کتنی محنت کی ہے ؟ اب اگر دشمن سے سامنا نہیں ہوتا تو وہ سب کچھ ضائع جائے گا۔"

" دشمن سے سامنا تو آخر ہو کے رہنا ہے۔" " مگر کب ؟ میں جب سے

پیدا ہوا ہوں اسی طرح بیٹھا ہوں ' مورچے میں ' اور وہ آنہیں چکتا۔"

"ہاہاہا..... ابھی سے تھک گئے ؟ تم تو کیا۔جب سے میں پیدا ہوا ہوں ' بیٹھا ہوں ' اسی مورچے میں منتظر۔"

"مگر بابا وہ کیا کر رہا ہے ' آتا کیوں نہیں ؟"

" وہ تیاری میں مصروف ہو گا ' اپنے آپ کو اور مضبوط کر رہا ہو گا۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی صفوں میں کوئی نفاق ہو ' اسے درست کر رہا ہو ' کوئی نیا ہتھیار ایجاد کر رہا ہو یا ویسے ہی ہمیں تھکا کر غافل کرنا چاہتا ہو ' ہزار باتیں ہو سکتی ہیں۔"

" بابا میں اس چھت پر رہتے رہتے تھک گیا ہوں۔میں کبھی سڑک تک بھی نہیں گیا۔صرف اسے یہاں سے بیٹھا دیکھتا رہا ہوں۔میں باہر نکلوں گا ' سڑک پر گھوموں گا ' پھروں گا ' دوڑوں گا ' بھاگوں گا ' دونوں طرف دور دور تک جا کے دیکھوں گا۔"

بابا نے اسے خاموش کرانے کے لئے درشتی سے کہا۔" سنو۔"

اسے دور ــ ـــ بہت دور کہیں مارچ کرتی ہوئی فوج کی طرح کے بھاری بھرکم بوٹوں کی دھمک کا ہلکا سا شائبہ گزرا جھینگر پھر گانے لگا تھا۔پہلے سے بھی زیادہ اداس لے میں اپنی تنہائی کا مرثیہ۔

" بیٹے سنا تم نے ؟"

" کیا ؟ جھینگر کا بولنا ؟"

" نہیں مارچ کرتے ہوئے قدموں کی آواز۔"

جھینگر اب جوش میں آ کے لگاتار بولے جا رہا تھا۔" اس کمبخت کو بھی ابھی بولنا سوجھا۔تم غور سے سننے کی کوشش کرو۔"

دونوں نہایت توجہ سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگے۔کبھی ابھرتی کبھی ڈوبتی آواز اب نہایت دھیمے سروں میں نمودار ہو کر ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

" تڑک ' تڑک ' تڑک ....."

" بابا یہ دشمن ہے ؟ ادھر ہی آ رہا ہے۔"

" ہاں۔شاید۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے مورچے سے باہر کودا۔بیوی کو جگایا۔بیٹی سے کہا کہ ننھے کو نیچے دادی اماں کے پاس لٹا کر جلدی سے اوپر آ جائے۔لڑکی نے ننھے کو گود میں لیا ' ایک بار چوما اور پھر اسے سینے سے چمٹا کے پھرتی سے سیڑھیاں اتر

گئی۔وہ اپنے اپنے مورچوں میں چوکس ' ہشیار ' خاموش بیٹھے تھے۔بے قراری سے گھومتی ہوئی نظریں اندھیروں کی تلاشی لے رہی تھیں۔

"تڑک ' تڑک ' تڑک ' تڑک۔"

مسلسل آگے بڑھتی آ رہی تھی لیکن ابھی یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ مکان کے سامنے آ نکلے گی یا عقب میں۔

لڑکی ہانپتی ہوئی اوپر آئی اور باپ کے مورچے کے پاس جا کے کہنے لگی بابا' بابا!

(۱)

"ہاں"

"دادی اماں مرگئی۔"

"کیسے ؟"

"اس کی پھٹی آنکھیں چھت کو تکے جا رہی ہیں۔منہ کھلا ہے سانس بند ہے ' نبضیں غائب ہیں۔"

اس کی بیوی چیخی "تو کیا تم ننھے کو وہیں لاش کے پاس چھوڑ آئی ہو ؟"

"نہیں۔ ننھے کو دوسرے کمرے میں لٹا آئی ہوں اور دادی کے کمرے کا دروازہ بند کرکے باہر سے تالا لگا دیا ہے۔"

"تو نے دادی کو روشنی جلا کے دیکھا تھا ؟"

"ہاں بابا میں نے ٹارچ جلائی تھی۔"

"نبض ٹٹولی تھی ؟"

"میں نے سوچا تھا' پھر حوصلہ نہیں پڑا۔"

اس کی بیوی بولی "چل لڑکی اپنے مورچے میں۔" پھر محض خاوند کو سنانے کے لئے بولتی ہے لیکن احتیاطاً" انداز خود کلامی کا رکھے رہتی ہے۔" وہ بڑھیا نہیں مر سکتی۔میں جانتی ہوں۔وہ ہم سب کو مار کر مرے گی۔ سنسنی پھیلانے کے لئے ' توجہ حاصل کرنے کے لئے وہ پہلے ہزار مرتبہ اس طرح کے ڈھونگ رچا چکی ہے۔وہ تو چاہتی ہے کہ سب کا دھیان ہر وقت بس اسی میں لگا رہے۔اس کے لئے وہ لڑتی ہے ' روتی ہے پیٹتی ہے ' بھوکی رہتی ہے ' مر مر کے دکھاتی ہے ' بہانے باز کہیں کی۔"

"تڑک ' تڑک ' تڑک " آواز اب واضح طور پر سامنے ہی سے آ رہی تھی۔

اس نے سوراخ سے نظریں ہٹا کے چھت پر دیکھا۔ لڑکی ماں کے کہنے کے باوجود ابھی تک اس کے مورچے کے پاس کھڑی تھی ' کھوئی کھوئی سی مبہوت ' اس نے کہا۔" چلو بیٹی اپنے مورچے میں ' ہمیں اپنے پچھواڑے سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ضرورت ہوئی تو پھر تمہیں بھی ادھر بلا لیں گے۔" پھر بیٹے کو آواز دی کہ وہ ادھر آ کے ماں کے مورچے کو سنبھال لے۔ لڑکا مستعدی سے چھلانگ لگا کر مورچے سے نکلا اور ماں کے مورچے میں داخل ہونے لگا تو اتنے میں وہ سنبھل چکی تھی۔ کہنے لگی۔" جاؤ تم ' میں ٹھیک ہوں۔" باپ نے لڑکے کو اپنے مورچے میں بلا لیا۔

" تڑک ' تڑک ' تڑک ' تڑک۔"

" اپنی بندوقوں کے گھوڑے چڑھا لو ' لبلبیوں سے انگلیاں ہٹا لو۔ چاہے کچھ ہو جائے جب تک میں گولی نہ چلاؤں ' کوئی گولی نہ چلائے۔"

ان ہدایات کے بعد اس نے نعرہ لگایا۔ انہیں سمجھاتے ہوئے ' شاید سب سے زیادہ اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے " اور ہمارے حوصلے بلند ہیں۔"

لڑکے نے ایک بوری چوڑائی کے بل کھڑی کر کے دیوار میں سے اینٹ کھینچ لی اور سوراخ میں سے نالی باہر نکال دی۔ ان کے بدنوں سے اس طرح کی تھرتھراہٹ اٹھ رہی تھی جس طرح کی بجلی کے کھمبے کو زور سے ڈنڈا مارنے کے بعد اس پر ہاتھ رکھنے پر محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ تھرتھری ان کے ملے ہوئے کندھوں اور پہلوؤں کی وساطت سے ایک دوسرے کے بدنوں میں جذب ہو رہی تھی مگر لڑکے کے بدن سے زیادہ اور اس کے بدن سے کم۔ اس نے لڑکے کی پیٹھ تھپتھپائی۔ وہ ریس میں دوڑ کے آئے ہوئے گھوڑے کی طرح پسینے میں شرابور تھرتھرا رہا تھا۔ لڑکے نے جواب میں کہا۔" فکر نہ کرو بابا۔"

تڑک ' تڑک ' دفعتاً بند ہو گئی۔ کیسے ؟ کیونکر ؟ اسے تو مٹتے مٹتے ابھی بہت دیر میں مٹنا چاہئے تھا ' ان کی آنکھوں کے سامنے ستارے زمین سے آسمان کی طرف اڑنے لگے۔ مسلسل متواتر ایک لے میں آتی ہوئی قدموں کی موسیقی کی بجائے تڑا تڑ کے بے ہنگم ' بے جوڑ شور نے سوئی ہوئی فضاء کو چابک مارنے شروع کر دیئے۔

بابا! یہ کہاں حملہ ہوا ہے ؟ کس پر حملہ ہوا ہے ؟"

"کیا خبر کس پر حملہ ہوا ہے۔"

"یہ حملہ کرنے والے ہمارے بھی دشمن ہیں۔"

"شاید"

"شاید، شاید، شاید میں تنگ آگیا ہوں اس شاید سے۔کون دشمن ہیں ہمارے؟ کیوں ہیں؟ کہاں ہیں؟ کب سے ہیں؟ کب تک رہیں گے؟ وہ آخر ہمیں کیوں مارنا چاہتے ہیں، ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

"یہاں بگاڑنے وگاڑنے کی کوئی نہیں پوچھا کرتا۔دشمنی ہے، بس ہے۔جب سے دنیا بنی ہے دشمنیاں بھی ہیں اور اسی طرح چل رہی ہیں۔تمہارے سوال کے جواب میں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے دشمن گورے ہیں۔"

"گورے ہمارے دشمن ہیں؟ مگر ہم کالے تو نہیں۔"

"اگر ہم کالے نہیں تو پھر وہ کالے ہوں گے۔ہم لال ہیں تو وہ پیلے ہوں گے۔ہم پیلے ہیں تو وہ لال ہوں گے۔وہ ٹھنگنے ہیں تو ہم لمبے ہوں گے۔ہم لمبے ہیں تو وہ ٹھنگنے ہوں گے۔جو وہ ہیں وہ ہم نہیں۔جو ہم ہیں وہ، وہ نہیں۔"

گولیاں دونوں جانب سے تڑا تڑ چل رہی ہیں اور آسمان پر کلیڈی اسکوپ کی طرح ہر لحظہ نئے نقش و نگار ترتیب دیتی جا رہی ہیں۔

"بابا، اب یہ کیسے پتہ چلے کہ وہ ٹھنگنے ہیں کہ ہم ٹھنگنے ہیں۔وہ لمبے ہیں کہ ہم لمبے ہیں۔وہ کالے ہیں کہ ہم کالے ہیں۔وہ گورے ہیں کہ ہم گورے ہیں۔ وہ لال ہیں کہ ہم لال ہیں۔وہ پیلے ہیں کہ ہم پیلے ہیں۔ شاید وہ وہی ہوں جو ہم ہیں۔"

"ہا ہا۔بیٹے تم مجھ سے لڑتے تھے شاید کے استعمال پر۔ اب تم بھی سیکھ گئے ہو۔تم یہ پتہ کیوں چلانا چاہتے ہو کہ کون ٹھنگنا ہے کون لمبا۔کون گورا ہے کون کالا۔کون پیلا ہے کون لال۔ کیا ٹھنگنے ٹھنگنوں کو نہیں مارتے؟ کیا گورے گوروں کو نہیں مارتے؟ کیا کالے کالوں کو نہیں مارتے؟ کیا پیلے پیلوں کو نہیں مارتے؟ کیا لال لالوں کو نہیں مارتے؟ کیا لمبے، لمبوں کو نہیں مارتے؟ ہم سب ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔"

"یہ تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔"

"تو تم سے کس نے کہا تھا کہ کچھ بات ہو گی۔"

ڈھم م م م ..... ڈھم م م م ..... ڈھم م م م .....

تڑا تڑ بند ہو گئی۔ دور ' سامنے شعلے آسمان کی طرف بلند ہو رہے تھے۔

"بابا ! اب وہ ادھر آئیں گے۔ پہلے تڑاتڑ پھر ڈھم۔"

"ہاں ! ہو سکتا ہے اگر وہ ہمارے دشمن ہوئے تو۔"

"کیا کہتے ہو بابا ؟ تو کیا وہ ہمارے دشمن نہیں بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے ہمارے ہی جیسے ایک گھر پر پہلے گولیاں چلائیں اور پھر اس پر بم مار مار کر آگ لگا دی۔ کیا وہ ہمارے دشمن نہیں۔"

"ممکن ہے وہ ہمارے دوست ہوں اور انہوں نے ہمارے دشمن کے گھر کو تباہ کیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں ہی ہمارے دشمن ہوں اور آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ یہ تو خوشی کی بات ہو گی۔"

"نہیں بابا نہیں۔ جب وہ اس گھر پر گولیاں برسا رہے تھے تو ہمیں پیچھے سے جا کر ان پر حملہ کر دینا چاہئے تھا۔ چاہے وہ ہم سب کو مار ڈالتے ' ہمارے گھر کو پھونک دیتے ہمیں اس کی پرواہ نہیں کرنا چاہئے تھی۔"

اس نے بے بسی سے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے منہ میں کہا "جذباتی لڑکا۔"

جلتے ہوئے گھر کی روشنی نے ہر طرف اندھیروں کو پرے دھکیل دیا تھا۔ وہ چھت پر ایک دوسرے کے سرخ روشنی میں نہائے چہرے باسانی دیکھ سکتے تھے۔ مغرب کی طرف روشنی آسمان پر شفق کی طرح پھولی پڑتی تھی۔ جھینگر اپنے بے وفا محبوب کو بھول کر کسی درخت کی کھوڑ میں سہما بیٹھا دیکھ رہا ہو گا اور سوچ رہا ہو گا کہ آج شاید سورج مغرب سے طلوع ہو رہا ہے۔

دور کہیں تڑک ' تڑک کی آواز فضاء میں تحلیل ہوتے ہوتے گم ہو گئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور مسکراتے ہوئے فخریہ انداز میں بیٹے کی پیٹھ ٹھونکی۔

اس کی بیوی نے تیکھی طنزیہ آواز میں پوچھا۔ "سنا تم نے ؟"

"کیا ؟"

وہ مورچے سے باہر نکلنے کے لئے اٹھی ' سیڑھیوں کے اوپر بنی ہوئی کمرہ نما تعمیر کی دیوار پر اس کا بہت بڑا سایہ دوہرا ہوا ' پھیلا ' اپنا دیو نما ہاتھ نچا رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے ہونٹ ہلے۔ "تم کیوں سنو گے ؟"

" آخر کیا؟ " کہتے ہوئے وہ بھی مورچے سے باہر آگیا۔اس کے پیچھے لڑکا کود آیا۔پرلے کونے سے بیٹی بھی چلی آرہی تھی۔اب پوری دیوار پر چار بڑے بڑے سر پاس پاس ایک دائرے کی شکل میں جمے ہوئے تھے۔جیسے جلتے ہوئے گھر میں مرنے والوں کے بھوت اس دیوار پر اکٹھے ہو گئے ہوں' باہم مشورے کے لئے کہ کس طرح اس خاموش رہنے والے گھر سے اپنی موت کا انتقام لیں۔

ایک بھوت کے ہونٹ بڑے مضحکہ خیز انداز میں تیزی سے چل رہے تھے اور ان میں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔اتنے بڑے سر کے حلق سے اگر آواز نکلتی تو پورا ماحول گونج اٹھتا' مگر ایک عام سی آواز الٹے رخ سے نکل کر بے آواز پھڑ پھڑ کرتے ہونٹوں کو اور زیادہ مضحکہ خیز بنا رہی تھی۔" تمہاری ماں نیچے چلا چلا کر کہہ رہی ہے۔تم مجھے مارنا چاہتے ہو' میں نہیں مروں گی' نہیں مروں گی۔

دوسرے بھوت نے کئی من وزنی سر انکار میں ہلایا" میں نے کوئی ایسی آواز نہیں سنی۔"

پھر درخت کے تنے جیسی گردن ذرا جھکی "کیوں بچو تم نے کچھ سنا؟"

چھوٹے دو بھوت بیک زبان بولے "نہیں بابا۔"

"تم سب بہرے ہو۔"

"یوں کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارے ہی کان بج رہے ہیں۔وہ اگر زندہ ہے تو اور بھی اچھی بات ہے۔"

مکان دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔شعلے فضاء میں بلند تر ہونے کی کوشش میں مصروف تھے۔

اس نے تڑاک سے جواب دیا۔" خوش نہ ہو' وہ زندہ نہیں۔یہ میں جانتی ہوں۔لیکن اتنی عیار اور سخت جان ہے کہ مرنے کے باوجود بولے چلی جاتی ہے۔میں نے ایسی کئی بوڑھیاں دیکھی ہیں جن کی آواز قبروں میں دفن ہونے کے بعد برسوں تک فضاء میں لہراتی رہتی ہے اور وقفے وقفے سے عود کرتی رہتی ہے تاکہ اپنا آپ جتلا سکے' زندوں پر اثر انداز ہو سکے اور بعض اوقات اپنا کام بھی کر جاتی ہے۔"

" اگر وہ مرگئی ہے تو تم کیوں بلا وجہ اسے بدروحوں میں شامل کرنے پر تلی ہو۔نفرت نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔میں خود نیچے جاتا ہوں۔بیٹی! چابی کہاں ہے؟"

"بابا جہاں ٹارچ پڑی ہوتی ہے۔وہیں اس کے پاس رکھ کے آئی ہوں۔"

غصے اور رنج میں بھرا ایک سر چلا ' ناک کئی فٹ آگے چل رہی تھی۔دروازے نے خاموشی سے اسے اپنے حلق میں اتار لیا۔سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ رک کر بولا۔"اتنے غافل نہ کھڑے ہو ' باہر جھانک کر دیکھ لو کہیں دشمن نے گھیرا ہی نہ ڈال لیا ہو۔"

تین سر کھڑے تھے تصویر بنے۔درمیان میں سے ایک بڑے سر کی جگہ خالی ہو چکی تھی سامنے مکان پوری شدت سے جلے جا رہا تھا۔ان کے رنج اور نفرت سے بھی زیادہ شدت سے ۔

چند منٹوں کے بعد پھر وہی سر جھکا ہوا ' آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا ان کے پاس آ کے رک گیا۔"ہاں وہ مر گئی ہے۔"

دوسرا بھوت بولا۔"چلو اچھا ہوا ۔"

پہلے بھوت کے ہونٹ یک دم اتنے تیز ہو گئے کہ چکی کے پاٹ جتنے بڑے ہونے کے باوجود نظر جانچ نہیں سکتی تھی کہ کب بند ہو رہے ہیں اور کب کھل رہے ہیں۔" اس نے تم پر کون سے ایسے ستم ڈھائے تھے ' اس نے تم پر کون سے ایسے ظلم توڑے تھے جو تم اس کی موت پر اتنی خوش ہو۔یہ تو سوچو کہ وہ آخر میری ماں تھی۔اس نے مجھے پالا ' پوسا ' جوان کیا۔میں نے اس کے سینے سے زندہ رہنے کی طاقت حاصل کی۔وہ صرف میری ماں ہی نہ تھی ' تمہارے بچوں کی دادی بھی تھی جو تمہیں اتنے پیارے ہیں۔ان کے گوشت پوست میں اس کا بھی حصہ ہے ۔

"میں یہ سب جانتی ہوں اور میں نے اپنی خدمت سے اس کے احسانوں کا بدلہ چکا دیا تھا۔ وہ ہر پھڈے میں ٹانگ اڑاتی تھی ' ہر معاملے میں دخل دیتی تھی ' ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ خود نہیں بدلتی تھی اور ہر چیز کو اپنی وضع اور ڈھب پر لانا چاہتی تھی ' چلو چھوڑو اس قصے کو اب اس کا مر جانا ہی بہتر....." بولتے بولتے وہ یکدم رک گئی اور پھر تقریباً چیختے ہوئے بولی۔"سنو۔ سب غور سے سنو"

(۲)

پاتال کی گہرائیوں سے ایک آواز اپنی گھمبیرتا میں ڈوبی ' آہستہ آہستہ ابھر کے ڈوب رہی تھی۔

" میں نہیں مروں گی ' نہیں مروں گی۔اس گھر کا نظام میں چلاؤں گی جس طرح چاہوں گی میں نہیں مروں گی ۔"

" کیوں ؟ اب بتاؤ ؟"

" آواز تو ہے اور وہ بھی میری ماں کی ۔"

" دیکھ لو موت کے بعد بھی وہ ہم پر مسلط رہنے کے لئے مصر ہے۔وہ مر گئی ' یہ اچھا ہوا کہ نہیں ' وہ وقت کے آگے بند باندھنا چاہتی ہے۔وہ کلاک کو الٹا گھمانا چاہتی ہے۔وہ ہماری گردنوں میں ایک مردہ بوجھ کی صورت لٹکا رہنا چاہتی ہے۔وہ ہر لحاظ سے اپنا وقت پورا کر چکی تھی۔اب میری باری آنی چاہئے تھی کہ میں اس گھر کو چلاؤں۔ آزادانہ اپنی مرضی کے مطابق۔"

جلتے ہوئے مکان سے اٹھتے ہوئے شعلوں کے قد اب کچھ نیچے ہو گئے تھے ۔

اس نے رنج و غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا ۔" تم اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھو میں جا کر اس کے لئے قبر کھودتا ہوں 'کوئی ایسی ویسی بات ہو تو آواز دے لینا ۔"

" قبر کہاں کھودو گے ؟"

" نیچے اندر والے صحن میں ۔"

" میں اسے اپنے گھر میں دفن نہیں کرنے دوں گی ۔"

" تو پھر کہاں دفن کروں ؟"

" باہر"

" باہر ؟ یہ کیسے ممکن ہے ؟ کیا تو جانتی نہیں کہ گھر سے باہر کوئی قدم نہیں نکال سکتا۔میں اتنی دیر باہر کھلے میں ٹھہر کر قبر کیوں کر کھود سکتا ہوں ۔"

" تو پھر اسے دفن مت کرو ۔"

" تو کیا کروں ؟"

" اس کی لاش کو باہر سڑک پر پھینک دو۔صبح ہونے پر کوے کتے کھا لیں گے۔ اس طرح اس کی آواز بھی جلد آنا بند ہو جائے گی ۔"

" میں اپنی ماں کی لاش کو باہر سڑک پر پھینک دوں ؟ کیا بیہودہ باتیں کرتی ہو ۔"

"صحن میں دفناؤ گے تو جب تک یہ گھر رہے گا اس کی آواز گونجتی رہے گی۔ "

"گونجتی رہے ' میں اسے یہیں صحن میں دفن کروں گا۔ " یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں

اترنے لگا۔

" دیکھو اس طرح کی بدروح ہمیشہ اس مکان پر اپنا سایہ کئے رکھے گی۔اس کی آواز بار بار گونجتی رہے گی۔تم ہم سب کے لئے ایک مستقل عذاب کھڑا کر رہے ہو۔میں کہہ رہی ہوں اس کی لاش یہاں مت دفنانا' مت دفنانا۔" وہ چیختی رہی اور وہ اس کی بات ان سنی کرکے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

جلتے ہوئے مکان سے اٹھتے ہوئے شعلے اب نیچے کہیں دبک گئے تھے۔چاروں طرف سے سرخ روشنی سمٹ کر اب سامنے صرف ایک مقام پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔وہ تینوں اپنے اپنے مورچوں میں خاموش بیٹھے پچھلے صحن سے ایک باقاعدگی سے اٹھنے والی دھمک' دھمک کی اداس 'گہری تنہا سی آواز سن رہے تھے' صحن کے وسط میں کمر تک ننگا ایک سایہ دونوں ہاتھوں میں کدال تھامے' ٹانگیں چوڑی کئے کھڑا ایک ست تسلسل سے مگر مشین کی سی باقاعدگی سے زمین کھودے جا رہا تھا۔دھمک .... دھمک .... جب اس کی بیوی نے اوپر سے جھانک کے دیکھا تو وہ مٹی کے دو ڈھیروں کے درمیان کمر تک زمین میں اتر چکا تھا۔اس کی بیوی نے آواز دی "سنو۔"

اس نے کدال باہر پھینکا' ماتھے سے پسینہ پونچھا اور ہانپتا ہوا گڑھے سے باہر نکل کے کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہے؟"

" اس بے معنی کام کو جانے دو۔اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔الٹا نقصان ہو گا میری بات مان لو۔"

"بکواس بند کرو۔"

" اچھا تو پھر یہ کرو۔ دونوں بچوں کو نیچے بھیج رہی ہوں' ننھے کو اوپر لانے کے لئے۔تم ذرا سیڑھیوں میں آ جاؤ' وہ نیچے آنے سے ڈر رہے ہیں۔"

" بھیج دو۔"

دونوں بچے خوفزدہ اور سہمے سہمے اس کے قریب پہنچے تو اس نے کہا " میری بہادر بیٹی' میرا جرات مند بیٹا لاش سے ڈرتے ہیں؟ ہم سب چلتی پھرتی لاشیں ہی تو ہیں جب تک چلتی پھرتی ہیں 'گولیاں چلاتی ہیں' مکانوں کو آگ لگاتی ہیں' زیادہ ڈرنے کی چیز ہیں۔جب چلنا پھرنا چھوڑ دیتی ہیں تو محفوظ ہوتی ہیں اور کسی کو گزند نہیں پہنچا سکتیں۔

(۳)

اس کی بیٹی بولی "پھٹی آنکھیں ' کھلا منہ ' ڈر آتا ہے۔ بابا! مر کے تو دادی اماں کچھ اور ہی طرح کی لگتی ہیں۔

"میں نے انہیں چادر سے اچھی طرح ڈھانپ دیا ہے۔ یوں کرتے ہیں کہ ایک طرف سے تم دونوں اٹھاؤ اور دوسری طرف سے میں اٹھاتا ہوں اور چارپائی قبر کے پاس لئے چلتے ہیں۔ پھر تم اوپر چلے جانا باقی میں خود کر لوں گا۔"

وہ تینوں دروازوں سے ٹکراتے ' چیزوں سے الجھتے ' چارپائی کو اٹھائے ' بوجھل بوجھل قدموں سے چلتے اسے کمرے سے نکال کر برآمدے میں لے آئے ' لڑکی نے دبی آواز میں کہا۔ "بابا میرے تو ہاتھ تھک گئے۔"

"اچھا چارپائی رکھ کے دم لے لو۔"

اوپر سے اس کی بیوی کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی "وہ پھر چیخ رہی ہے ' چلا رہی ہے ' خدا کے لئے میرے بچوں کو تو وہاں نہ روکو انہیں ابھی اوپر بھیج دو ' وہ ڈر جائیں گے۔"

"کچھ بھی نہیں ' خاموش لاش چادر میں لپٹی پڑی ہے۔ بچے تو ٹھیک ہیں بس ایک تمہیں واویلا مچا رہی ہو۔

"وہ کھانے کو مانگ رہی ہے۔ ابھی اٹھ کے کسی کا ہاتھ پکڑ لے گی ' کسی کو چمٹ جائے گی"

دونوں بچے ہڑبڑا کر اندر بھاگ گئے ' وہ ناچار اکیلا ہی چارپائی گھسیٹتے ہوئے قبر کے پاس لے گیا اور پھر کدال پکڑ کے قبر میں اتر گیا۔

دونوں بچے اوپر جا کر پھر سے اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ گئے ' ننھا ' ماں کی چھاتیوں میں منہ دیئے دودھ کھینچ رہا تھا اور وہ سوراخ سے باہر سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں دھمک ..... دھمک کی آواز باقاعدگی سے آ رہی تھی۔ اڑا ' اڑا دھم ایک دو شعلوں نے آخری بار بھڑکتے ہوئے اپنی گردنیں اونچی اٹھائیں۔ چنگاریوں کی ایک کہکشاں زمین سے آسمان کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ ننھے نے گھبرا کے چھاتی چھوڑ دی ماں کا چہرہ دیکھا اس پر اطمینان و سکون پھیلا تھا۔ اس کے ننھے ننھے ہونٹ پھر دودھ کی تلاش کر رہے تھے۔ دھمک دھمک کا تسلسل جو کہیں کھو سا گیا تھا پھر

جاری تھا۔ جھینگر پھر سے اپنا درد بھرا گیت الاپنے میں محو تھا۔ جیسے دنیا میں اس کے محبوب کی بے وفائی کے علاوہ باقی سب ٹھیک ہے ' لڑکے نے بے چینی سے کئی بار پہلو بدلا ' آخر رہا نہ گیا " اماں! وہ مکان اب راکھ کا ڈھیر بن گیا ہو گیا۔"

" ہاں ' لیکن راکھ ابھی بہت گرم ہو گی۔"

"ہم سب اپنے اپنے مکانوں میں سدا سے قید بیٹھے ہیں ' کیوں ؟ تا کہ دشمن آئے اور باری باری آکر مکانوں کو تباہ کرتا رہے ' ہم کیوں اس کا انتظار کئے جا رہے ہیں۔ ہم باہر کیوں نہیں نکلتے ؟ ہم سب مل کر ایک ہی بار اسی کے اڈے پر پہنچ کر اس کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے۔"

تمہارے بابا کو تو جنون ہو گیا ہے خدا نے کیا تھا کہ اب وہ عورت مر گئی تھی تو سارا ٹنٹا ختم ہو گیا تھا۔ جیسے میں نے کہا تھا اس کی لاش کو اٹھا کر باہر پھینک دیتا تو ہمیں اس کے بھوت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل جاتا۔ تب ہم مل کر اطمینان سے چار دیواری اور اونچی کر لیتے اتنی کہ آسمان تک بلند پورے مکان کے چاروں طرف ریت کی بوریاں لگا دیتے چھت کے مورچوں کے علاوہ بیرونی دیوار پر بھی جا کے مورچے لگا لیتے ' پھر میں دیکھتی کوئی دشمن ہم پر کیسے حملہ آور ہوتا۔"

" اماں تم میری بات ہی نہیں سمجھیں۔ بھلا دادی کا ذکر کہاں سے لے آئیں ' میں تو دشمن کی بات کر رہا ہوں ۔"

" دشمن کی بات کا مطلب ہے اپنے گھر کی حفاظت کی تدبیر ' جب وہ زندہ تھی تو میرا کسی کام میں دلچسپی لینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اب یہاں دفنانے سے اس کی آواز میرے کان میں برابر رخنہ ڈالتی رہے گی اور میں مکان کی حفاظت کے منصوبے پر پوری طرح عمل نہ کر سکوں گی۔ مگر تمہارے بابا کو کون سمجھائے۔"

" لیکن دیواریں اونچی کرنے سے کیا ہو گا وہ توپ لے آئے گا۔"

" ہم چوڑی چوڑی خندقیں کھود لیں گے۔

" وہ کشتیاں بنا لے گا۔"

" ہم اسے غرق کر دیں گے۔"

" لیکن ہم یوں کیوں نہیں کرتے کہ دشمن کا ہی پتہ چلا لیں۔"

" پھر وہی بیہودہ بات ' لوگوں کو اگر پتہ ہو کر فلاں شخص ان کے گھر میں چوری

کرے گا تو پہلے ہی اس کو جا کر پکڑلیں۔اپنے گھروں کو تالے کیوں لگائیں۔"

"تو ہم پہلے دنیا کے ہر شخص کو چور سمجھتے ہیں پھر اپنے گھر کو تالہ لگاتے ہیں۔"

"ہاں! بالکل اسی طرح جیسے سب ایک دوسرے کے لئے چور ہیں' سب ایک دوسرے کے لئے دشمن ہیں۔"

"اماں! یوں ہی باقی دنیا کے لئے ہم دشمن ہوں گے وہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہم سے ڈرتے ہوں گے' خوف کھاتے ہوں گے ہمارے خلاف اپنی حفاظت کی تدابیر کرتے ہوں گے ہم نے ان کی راتوں کی نیندیں اور دنوں کا چین حرام کیا ہو گا۔وہ بھی اسی طرح اپنے مورچوں میں ریت کی بوریوں میں گھرے آنکھیں پھاڑے' اندھیروں کو ٹٹول رہے ہوں گے' ہمارے انتظار میں۔"

"ہاں۔"

"ہم یوں کیوں نہ کریں کہ اپنی چھت پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیں کہ ہم کسی کے دشمن نہیں۔ہم کسی گھر پر حملہ نہیں کریں گے کسی گھر کو آگ نہیں لگائیں گے' کوئی ہمارے گھر پر حملہ نہ کرے' کوئی ہمارے گھر کو آگ نہ لگائے پھر ہم کھلے میں نکل جائیں۔بوریاں اٹھوا دیں بندوقیں الماریوں میں بند کر دیں۔آہاہا وہ کتنا اچھا وقت ہو گا' ہم آزادی سے جہاں چاہیں گے گھومیں گے' پھریں گے اور یہ انتظار کی مصیبت بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔"

"تمہاری طرح کی بھیڑیں آزادی سے پھرنے کے شوق میں جلد ہی کسی بھیڑیئے کا لقمہ بن جاتی ہیں۔"

"نہیں اماں' ہماری دیکھا دیکھی دوسرے بھی یہ فیصلہ کریں گے' آخر وہ بھی تو تھکے ہوئے ہوں گے۔"

"یہ بات پوری طرح ابھی تمہارے منہ سے نکلی بھی نہ ہو گی کہ کوئی جھٹ سے آکے ہمارے مکان پہ قبضہ کرلے گا۔جاگتے رہنا' ہشیار رہنا' اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت تیار رہنا' یہی اس دنیا میں زندہ رہنے کا اصول ہے۔"

"اماں! وہ مکان بھی تو جل گیا۔اس کے رہنے والے بھی تو مارے گئے ہم بھی تو محض اپنی باری ہی کے منتظر ہیں۔انھوں نے مقابلہ کر کے بھی تو گھر تباہ کرالیا آؤ ہم اعتماد کر کے تباہ کروالیں۔آخر کہیں سے تو ابتدا ہونی چاہیے' ایسے کب تک چلے گا۔

(۴)

" یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم خود ہی گھر کو آگ لگا کے اپنے سینوں میں گولیاں مار لیں بیٹے ! ہم دن رات بندوقوں میں گولیاں بھرے مورچوں میں اس کے منتظر بیٹھے رہتے ہیں ' آخر کیوں ؟ ہم نے اپنا آرام ' آسائش ' زندگی کا سارا لطف تیاگ دیا ہے۔ کیوں ؟ کیا میں اور تمہارا بابا پاگل ہیں ' صرف اس لئے کہ وہ ہر وقت ہماری تاک میں لگا ہے۔ اور ہمارے کمزور لمحات کو جانچنے کی فکر میں رہتا ہے تاکہ جونہی مناسب موقع ملے تو ہم پر ٹوٹ پڑے اور ہمیں ختم کر دے۔"

" کیوں نہ اس کے ٹوٹ پڑنے سے پہلے ہی کہہ دیں کہ وہ ہمارا مکان لے لے ہمارا مکان تو اس کا ہو جائے گا لیکن اس طرح جو کچھ اس کا ہے وہ بھی تو ہمارا ہو جائے گا۔"

" یوں نہیں ہو گا۔ صرف جو کچھ ہمارا ہے وہ اس کا ہو جائے گا تمہیں آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت پھر بھی نہ ہو گی۔ تب تم اس کے تحت ' اس کے غلام بنے ' اس کے گھر میں ' ریت کی بوریوں کے درمیان ' اسی طرح مورچوں میں بیٹھے اس کے دشمنوں کا انتظار کر رہے ہو گے۔"

بیٹی اپنے مورچے سے پکاری " اماں یہ کیا ہے ؟ گھر کے اندر تو تم کہتی ہو محبت ' اتفاق اور بے غرضی سے رہو اور باہر والوں سے عداوت ' دشمنی اور خود غرضی کا سبق دیتی ہو اور محبت ہے کہ ہم نے گھر کے اندر بھی کبھی نہیں دیکھی صرف لڑائی ہی ایک حقیقت ہے ' باہر بھی اور اندر بھی۔ میں جنگ سے تھک گئی ہوں ' بالکل تھک گئی ہوں ' بلکہ ہم سب تھک گئے ہیں۔ بھیا ! یوں کریں کہ کل صبح ہونے پر ہم بندوقیں پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا کر گھر کے باہر کھڑے ہو جائیں گے ' اور پکار پکار کے کہیں گے کہ ہم تمام دنیا میں صلح چاہتے ہیں ' امن چاہتے ہیں خود زندہ رہو اور ہمیں زندہ رہنے دو کالے گورے ' لال پیلے سب انسان ہیں ایک ہی طرح کے ' ایک ہی جیسے تو پھر جھگڑا کیوں کریں۔"

" ہا ہا ہا ' بیٹا تو پاگل تھا ہی ' بیٹی بھی پاگل ہو گئی ' خیالی دنیا کی باتیں کرتی ہے۔ انسانوں کا فرق ازلی ہے ' ان کا تفاوت ابدی ہے۔ ہر ایک کا مفاد دوسرے سے ٹکراتا ہے ' اسی کا نام دشمنی ہے۔"

"نہیں اماں" اس کے بیٹے نے کہا۔ "کسی نہ کسی کو تو اپنی ذات سے باہر پہلے قدم اٹھانا ہی ہے کیوں نہ ہم ہی پہلے قدم اٹھالیں۔"

نیچے سے آواز آئی "سنو۔"

عورت نے دیوار پر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہ مٹی کے ڈھیر پر کدال ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا۔ پاس چادر میں لپٹی لاش چارپائی پر پڑی تھی "کیا بات ہے؟"

"میں قبر کھود کے دیر سے بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ اکیلا لاش کو قبر کے اندر کیسے اتاروں، تم تینوں اگر ہاتھ بٹا دو تو ایک منٹ میں کام ختم ہو جائے گا۔"

"ہم مورچے خالی چھوڑ کر کیسے آسکتے ہیں"

"صرف ایک منٹ کی بات ہے۔"

"تم ایسے کرو، چارپائی قبر کے گڑھے کے نزدیک کر کے الٹ دو، لاش اس میں لڑھک جائے گی پھر مٹی ڈال کر اوپر آجانا۔"

چھ فٹ گہرے گڑھے میں لاش لڑھکا دوں؟ میں اپنی ماں کے احسانوں کا بدلہ اس کی لاش کی اس طرح بے حرمتی کر کے دوں؟ خدا کے لئے میری بات مان جاؤ ضد نہ کرو۔"

"میں ضد ہرگز نہیں کر رہی تم ذرا بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اتنی بھاری بھرکم، بوجھل لاش ہم چاروں کے بس کی بھی نہیں، اسے قبر میں اتارنے کے لئے تو تمہارے جیسے تین جوان مرد اور چاہئیں۔ اچھا تم ایسے کرلو کہ قبر کے ایک کنارے کو کھود کے گڑھے کے وسط تک ایک لمبی ڈھلوان بنا لو اور اس پر چارپائی گھسیٹ کر لے جاؤ اور پھر چارپائی دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف الٹاتے الٹاتے لاش کو گھٹنوں پر لے لو اور پھر وہاں سے زمین پر لٹا دو اور اس کے بعد مٹی ڈال کر اوپر آجاؤ۔ لاش کی بے حرمتی بھی نہ ہو گی اور کام بھی بن جائے گا۔"

"دیکھو! اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور تم تنگ کرنے پر تلی ہو، میری مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ یہ موقع میری مرحوم ماں سے دشمنی نبھانے کا نہیں اس کی آخری خدمت اب صرف یہی ہے کہ اسے باعزت طور پر دفنا دیا جائے اور یہ خدمت کرنا میرا فرض ہے۔"

"باعزت طور پر دفنانے کے لئے اس کی میت کو غسل دینا اور کفنانا ضروری تھا

جب وہ سب کچھ نہیں کیا تو قبر میں لڑھکانے سے کیوں ڈرتے ہو؟"

" اور کچھ نہیں تو دونوں بچوں کو بھیج دو ' میں انھیں کی مدد سے لاش کو قبر میں اتارنے کی کوئی ترکیب کرلوں گا۔"

" یہ کام بچوں کے کرنے کے نہیں ہوتے وہ ڈر جائیں گے۔ان کے چھوٹے چھوٹے دلوں پہ ہمیشہ کے لئے خوف بیٹھ جائے گا جس طرح کی بد روح وہ ہے تم جانتے ہو وہ انھیں پکڑ لے چمٹ جائے ' کھالے تو میں کیا کرلوں گی۔"

" دنیا کی ذلیل ترین عورت ' سن لے ' میں اکیلا یہ ساری مصیبت بھوگ لوں گا لیکن تمہیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گی۔"

" دھمکیوں پر اتر آئے ہو؟ میں ان سے ڈرنے والی نہیں ' جو تمہارے دل میں آئے کرلینا۔"

بچوں نے بہت ملتجیانہ انداز میں کہا " اماں ہم بابا کی مدد کر دیتے ہیں کیا حرج ہے۔بلاوجہ انھیں کیوں ناراض کریں۔"

" بکواس بند کرو ' تم نہیں جانتے ' وہ مر کر ڈائن بن چکی ہے ' وہ میری اور تمہاری دشمن ہے ' ہم میں سے کسی نے بھی اس کی لاش کو ہاتھ لگایا تو اسے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

" نہیں اماں ہم بابا......"

" میں کہتی ہوں چلو اپنے مورچوں میں کتنی دیر سے یہاں کھڑے باتیں بنا رہے ہو تم میں سے کسی نے ایک بار بھی باہر جھانک کر دیکھا ہے؟ دشمن چپکے سے آکر گولیاں برسانی شروع کر دے تو مزاج ٹھکانے آجائیں گے ' نہیں اماں ' نہیں اماں ڑاتے پھر رہے ہیں۔بڑے آئے بابا کے لاڈلے ' چلو اپنے مورچوں میں۔"

نیچے صحن میں سے کدال چلنے کی آواز پھر آرہی تھی اداس ' گہری ' تنہا سی آواز ' ایک ست تسلسل مگر مشین کی سی باقاعدگی سے دھمک ' دھمک ابھر رہی تھی تو اس کے خاوند نے قبر کا ایک کنارہ توڑ کر ڈھلوان بنانے کا آغاز کر دیا تھا ' ایک لمبی ڈھلوان جس پر وہ چارپائی گھسیٹ کر قبر کے گڑھے کے اندر لے جاسکے اس کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ پھیل گئی اس نے ننھے کو گود میں سنبھالتے ہوئے سوراخ سے باہر دیکھا ' وہی اندھیرا اور سامنے سڑک کا واہمہ سا لیٹا تھا اس مکان کی تو راکھ بھی اب

تک ٹھنڈی ہو چکی ہو گی ' شاید درمیان میں انگارے ابھی زندہ ہوں اس کا دل بری طرح چاہنے لگا کہ اس اداس ماحول میں وہ جھینگر ہی گانا شروع کر دے تو کم از کم کانوں میں گرداب بنا کے گھستا ہوا سناٹا کچھ تو کم ہو اس نے ریت کی بوریوں سے ٹیک لگا کے کہکشاں کو دیکھا کہ مغرب میں کہاں تک پہنچ گئی ہے لیکن آسماں پر کہکشاں تو کیا کوئی ایک ستارہ بھی نہ تھا ہر طرف گہرے بادل آسماں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ایک ننھی سی بونداس کی ناک کی پھنگی سے ٹکرا کر پھیل گئی ' اس نے ننھے کو اوڑھنی سے ڈھانپ لیا ' بوندیں تیز ہو گئیں چھت کے فرش پر سے تک تک تک کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی اس نے بچوں سے پوچھا ' تمہارے پاس ترپالیں ہیں انھوں نے کہا " ہاں ہیں " اس نے اپنی تہ شدہ ترپال نیچے سے نکال کر مورچے کے اوپر پھیلا لی ' بارش خوب کھل کے برسنے لگی تیز بارش کے سر پٹختے ہوئے ہوئے قطروں کا شور ان کے کانوں میں اس طرح گونج رہا تھا جیسے انھوں نے اپنے سر کسی بہت بڑے آبشار کے نیچے دیئے ہوئے ہوں گھر کے چاروں طرف پرنالوں سے پانی ابل ابل کر دھاروں کی صورت میں نیچے گر رہا تھا ' ہوا کے زور سے بارش ان کے ترپالوں پر زور زور سے چابک تابڑ توڑ مارے جا رہی تھی بجلی کا ایک کوندا لپکا جو دور افق پر چلتے ہوئے گہرے سلیٹی بادلوں کے قلب تک میں گھس کر ' تڑپتا ' مچلتا ' ہلچل مچاتا چلا گیا درخت نہائے کھڑے جھوم رہے تھے ٹھیٹھر سانپ کی طرح کالی اور چمکدار سڑک لیٹی تھی ' سامنے پورا میدان منور ہو کر ایک حقیقت بن کے اس کی آنکھوں کے آگے ابھرا اور روشنی ختم ہوتے ہی پھر زمین سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گیا ' دیوار سے ٹکراتے ہوئے قطرے پھوار سی پیدا کر رہے تھے ' جو سوراخ میں سے اندر آکر اس کے کپڑوں کو نم کر رہی تھی اس نے سوراخ کے کھلے منہ میں اینٹ دے کر بند کر دیا بارش برسے جا رہی تھی اسی تندی و تیزی کے ساتھ ٹش شوں ں ل ل کسی نے بندوق ان کے کانوں کے اندر رکھ کر داغ دی ' اینٹ نکالی سامنے سڑک کے اوپر ایک نیم دائرہ سا ابھر اکھڑا تھا ' اس سڑک کے اوپر جو اتنے زمانوں سے ان کی آمد کے لئے آنکھیں بچھائے پڑی تھی۔انھوں نے ترپالیں اٹھا کر پھینک دیں۔

" اماں ! وہ پہنچ گیا۔"

" ہاں ' آخر "

"مگر کوئی تڑک بھی نہیں ہوئی۔ یہ اتنی خاموشی سے کیسے آگیا۔"

"بارش کی آڑ لے کر آیا ہے۔ بیٹی پچھلی طرف تو کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں اماں۔ نظر تو کچھ نہیں آ رہا"

"تم بھی یہاں میرے مورچے میں آ جاؤ"

بیٹے نے کہا "چلو انتظار تو ختم ہوا اماں! دشمن کو ایک بار کہ تو دیں کہ ہم جنگ نہیں چاہتے۔ ہماری اس سے کوئی دشمنی نہیں۔ وہ ہمیں الگ چھوڑ دے ہم اس پر گولی نہیں چلائیں گے اور جس راستے سے آیا ہے اسی راستے سے واپس چلا جائے"

"بزدل وہ یہ گھر تباہ کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے لئے سوائے لڑنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔"

بیٹی بولی۔ "ہم یہ گھر چھوڑ دیتے ہیں۔"

"وہ اس پر راضی نہیں ہو گا۔ تم گولی چلاؤ۔"

بارش قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی۔ اب کے سامنے سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ کئی گولیاں سرسراتی ہوئی، زخمی سانپ کی طرح بس گھولتیں، پھنکاریں مارتی، پیچ و تاب کھاتی، کلبلاتی ان کی ریت کی مردہ بوریوں میں لحظہ بھر کے لئے حرکت اور زندگی کی تھرتھراہٹ پیدا کرتی، گھس گھس کے ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔

"گولی چلاؤ" ان کی ماں نے پھر حکم دیا "تمہیں کہتی ہوں گولی چلاؤ نہیں تو وہ بیرونی دیوار توڑ کر اندر آ کر آگ لگا دے گا۔"

اب تینوں بندوقیں نہایت تیزی سے جواباً "گولیاں اگل رہی تھیں۔ دونوں طرف کی گولیوں سے خاموش و یران ماحول یکدم ایک میلے کی طرح با رونق پر جوش اور ہنگامہ پرور ہو گیا تھا۔ دشمن سڑک کے اوپر کچھ گٹھڑیاں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اب کھلے کی بجائے کسی اوٹ یا آڑ سے اکا دکا فائر آ رہا تھا گولیوں کی اندھا دھند بوچھاڑیں ختم ہو گئی تھیں "تم فائر جاری رکھو میں تمہارے باپ سے بات کر کے آتی ہوں۔"

وہ پانی میں بھیگی ہوئی لاش کی چارپائی کے ایک پائے کا سہارا لئے تر بتر زمین پہ بت بنا بیٹھا تھا اس کے سر کے اوپر بہت بلندی پر، گھپ آسمان کی جانب گولیاں ستارے بنی اڑی جا رہی تھیں۔ لاش کے اوپر دی ہوئی چادر اور چارپائی سے قطرات ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ چارپائی کے اوپر پھیلا کے دی ہوئی چادر کے نیچے لاش جو پہلے

بڑی بڑی اور بارعب نظر آرہی تھی۔اب چادر چارپائی کی خالی جگہ سے چپک جانے کی وجہ سے درمیان میں بہت تھوڑی سی جگہ گھیرے کسی بچے کی قبر نظر آرہی تھی اور اس نے اٹھ کے چادر کھینچ لی۔اچھی بھلی ' موٹی تازی بڑھیا پانی اور موت سے بالکل چپک کے رہ گئی تھی۔وہ اسے کس طرح کی نظر آرہی تھی ؟ ڈوبنے سے مری ہوئی چوہیا۔بھیگی ہوئی بلی ؟ جس کی فر کھال سے چپک گئی ہوا اور نیچے سے یکدم ہڈیوں کا ڈھانچہ نمودار ہوگیا ہو۔وہ تو وہ معلوم ہی نہیں ہو رہی تھی جو وہ تھی

جب اس نے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو وہ کھڑا چادر نچوڑ رہا تھا۔قبر اور وہ ڈھلوان جو ابھی پوری طرح بن نہ سکی تھی ' دونوں مل کر ایک چھوٹا سا تالاب نظر آرہے تھے ۔ پانی سے لبالب بھرا ہوا تالاب۔

" حملہ ہوگیا ہے ' تمہیں نہیں پتہ چلا ؟ "

چادر پٹختے ہوئے اس نے جواب دیا۔" دیکھو ! تم نے اس کا کیا بنا دیا ہے جو میری ماں تھی۔"

" میں کہتی ہوں دشمن نے حملہ کردیا ہے جنگ جاری ہے۔"

" تم لڑتی رہو۔"

" پہلا حملہ ہم نے پسپا کردیا ہے۔دوسرا حملہ اور زیادہ شدید ہو گا اور وہ بیرونی دیوار توڑ کر اندر آجائے گا۔تم خدا کے لئے منصوبے کے مطابق پیچھے سے جا کر ان پر حملہ کردو۔" '

" یہ مر کر مچھلی تو نہیں بن گئی کہ اسے تالاب میں چھوڑ کر خود حملہ کرنے چلا جاؤں ۔"

" تمہیں محض مردہ ماں کی لاش کا خیال ہے ہم زندوں کا کوئی فکر نہیں جو تباہی و بربادی کے کنارے پہنچ گئے ہیں۔"

" جسے تم زندہ نہیں دیکھ سکتی تھیں اب اس کی لاش قبر کے انتظار میں تمہارے سینے پر چڑھ کے بیٹھی رہے گی جب تک کہ یہ بو نہیں دے جائے گی۔جب تک اس کا گوشت گل سڑ کر جھڑ نہیں جائے گا۔اس کی آوازیں تمہارے کانوں میں گونجتی رہیں گی۔ہاہاہا اچھا ہے خوب گونجیں ۔"

" میں آکے چارپائی اندر رکھوا دیتی ہوں۔"

" تم اس چار پائی کو ہاتھ نہیں لگا سکتیں۔"

" بچوں کو بھیج دیتی ہوں۔"

" نہیں "

" مگر کیوں "

" وہ انھیں پکڑ لے گی ' انھیں چمٹ جائے گی۔ انھیں کھا لے گی '۔ ہا ہا ہا۔"

اس نے چادر لاش کے اوپر دی اور دوبارہ پائے کا سہارا لے کر بیوی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ گولیاں وقفے وقفے سے چل رہی تھیں۔

" دیکھو ضد نہ کرو ہم نے کتنی محنت اور مشقت سے اس گھر کی حفاظت کا انتظام کیا تھا ہم کب سے دشمن کے منتظر تھے اس کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پک گئی تھیں اور صبر کی آخری حد آگئی تھی آج وہ آگیا ہے اور ہم اسے شکست دے سکتے ہیں اب وہ منہ کی کھا کے گیا تو پھر ادھر آنے کا حوصلہ نہ کر سکے گا ہم تمام زندگی امن اور چین سے گزار سکیں گے خدا کے لئے میری بات مان جاؤ ابھی موقع ہے تم پیچھے سے جا کر حملہ کر دو۔"

" نہیں "

" میں آخری بار تم سے کہہ رہی ہوں کہ اٹھو اور جاؤ نہیں تو گولی مار دوں گی۔"

" تم اور مجھے گولی مار دو گی ؟ ہونہہ !"

" یہ ہم سب کی بقا کا سوال ہے اس گھر کے بچاؤ کا سوال ہے۔ اٹھو اور جاؤ۔"

" مجھے جس ماں نے جنم دیا ہے میں اس کی لاش کو اس طرح اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

" میں آخری بار تم سے کہہ رہی ہوں۔"

" نہیں نہیں نہیں "

ٹشوں ۔۔۔۔۔ ! اس کا مغز اپنی ماں کی چھاتی پر پڑا تھا ' ٹشوں ۔۔۔۔۔ ! اس کی بیوی کی بندوق سے نکلتے ہوئے شعلے پر گھر کے پچھواڑے سے گولی آئی اور اس کی بیوی کی گردن کے پار نکل گئی۔ وہ پلٹ کر چھت پر دھڑام سے گری اب گھر پر چاروں طرف سے تابڑ توڑ گولیاں برس رہی تھیں وہ دونوں کس کس رخ پر جا کے حملے کا

جواب دیتے۔

" بھیا ! دشمن کوئی دم میں چار دیواری توڑ کر اندر آنے والا ہے۔ "

" ہاں ' وہ آگے ہی بڑھتا آرہا ہے ہماری گولیوں میں جیسے کوئی اثر نہیں رہا تم بندوق پھینک دو اور ننھے کو اٹھا لو۔ "

لڑکی نے سہمے ہوئے بچے کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور پوچھا " اب ؟ "

" نیچے چلتے ہیں ۔بابا' اماں کی تجویز کے مطابق دروازے کھول کر جہاں سے ہمیں آخری حملہ کرنا تھا وہاں سے نکل کر دشمن کو بتاتے ہیں کہ ہم جنگ نہیں چاہتے ' ہم نے کبھی جنگ نہیں چاہی ' ہم امن چاہتے ہیں ' لڑائی ہم پر تھوپی گئی ہے۔ "

" اب وہ کیسے مانے گا ؟ بہت دیر ہو چکی۔ "

" وہ مانے نہ مانے سچ ہمارے دل تو جانتے ہیں۔ آؤ اتمام حجت کے لئے اس کو کہہ کے دیکھ لیتے ہیں۔ "

اس نے بھی بندوق پھینک دی اور وہ بڑی تیزی سے نیچے اتر گئے اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے چھوٹی بہن نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا ہوا تھا اور دوسرے سے گلے سے چمٹے ہوئے ننھے کو سنبھالا ہوا تھا۔

لڑکے نے پورا زور لگا کر بلند آواز سے کہا " سنو ! ہم .... "

مگر جب گولیاں چلتی ہیں تو دلیل سننے کی فرصت کسے ہوتی ہے ؟ انصاف کے قرینے کون جانتا ہے !!

ماتا رانی

چار پانچ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں کیکر کے درخت کی جڑ میں اینٹوں کے چولہے پر ایک ننھی سی کلیا رکھے چاول پکانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دھوئیں سے ان کی آنکھوں اور ناکوں سے سپڑ سپڑ پانی بہہ رہا تھا۔ پھونکیں مار مار کر مغز خالی ہو گئے تو ایک ذرا سا شعلہ تھوڑی دیر کو لہرا کے بجھ گیا۔ وہ پھر پھونکیں مارنے میں جت گئیں۔ راکھ اڑ اڑ کے کچھ تو ان کے بکھرے الجھے بالوں پر اور کچھ کلیا کے اوپر گرتی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کی سولہ سترہ سالہ شرمیلی بیٹی ہاتھوں میں تسلے پکڑے ان کے پاس سے گزریں تو ادھیڑ عمر عورت یہ کہے بنا نہ رہ سکی "ہائے ہائے ' ساری عمر یہی کڑوا دھواں اور یہی بے بس آنکھیں ہونی ہیں ' ابھی سے کیوں دکھ بھوگتی ہو۔"

"چاچی! ہم گڈی کے بیاہ پر بھت پکار ہی ہیں۔"

"مرو ' پکاؤ ' کسی کے کہے سے آج تک کوئی باز آیا ہے۔ جو میرے کہے سے تم باز آؤ گی۔"

وہ ساتھ ہی جوہڑ کے کنارے بیٹھ کے گیلی ' کالی چکنی مٹی کے تھوبے دونوں ہاتھوں سے نکال کر تسلوں میں بھرنے لگیں۔

ایک طرف بہت سی عورتیں گیلے نچڑتے کپڑے پہنے ' سمٹی سمٹائی بیٹھیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ انہیں گیلے کپڑوں میں سے بدن کی جھلکیاں چرائے جانے کا خوف تو تھا۔ مگر چونکہ گروہ کی صورت میں تھیں اور جتنی احتیاط ممکن تھی ' کر چکی تھیں۔ اس

لئے قدرے بے خوف ہو کر باتیں بھی کر رہی تھیں اور ہنس بھی رہی تھیں۔

پھیلا ہوا وسیع جوہڑ گاؤں کے باہر باہر بنے ہوئے کچے ' نیچے مکانوں سے پرے ہٹ کر گاؤں کی پوری لمبائی کے ساتھ ساتھ جو ایک کلو میٹر کے قریب ہو گی ' ہلکی سی قوس بناتا دوڑتا چلا گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جگنوؤں جیسے پیلے پھول کیکر کے درختوں کی لمبی قطار سے برس برس کر جوہڑ کے کنارے پہ ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ سیاہ کھردری کھال سے ڈھنپے بڑے بڑے تنوں والے کیکر برسات کے زمانے کی پر نم ہوا چاٹ چاٹ کر تیز چمک دار سیاہ رنگ کے ہو رہے تھے اور جلتی ہوئی دھوپ ان میں سے ایک بوجھل سگندھ کشید کر رہی تھی جو پھولوں کی دھیمی مہک کے ساتھ مل کر گرم اور حبس زدہ ماحول میں کسی ٹھوس چیز کی طرح اٹکی کھڑی تھی۔ گاؤں کے سامنے والے کنارے کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے "تت تہت مرجائیں" کی آوازیں اڑ کر کبھی کان میں آپڑتیں۔ دو کسان چمڑا منڈھے بڑے سے ٹوکرے کو دونوں طرف سے رسیاں ڈالے آمنے سامنے کھڑے ہو کر جوہڑ میں سے پانی نکال نکال کر دھان کے کھیت میں ڈال رہے تھے۔ دو لڑکے تہمد کو جال بنائے مچھلیاں پکڑ رہے تھے ' اس کنارے چونکہ ہل چل بہت کم تھی اس لئے تیز روشنی سبزی مائل شفاف پانی میں نظر کو سطح سے بہت نیچے تک اپنے ساتھ لے جاتی ' کیڑوں کی ننھی ننھی جانیں ادھر سے ادھر پھسلتی ہوئی یوں دکھائی پڑتیں جیسے کسی ہنگامی صورت حال سے بچ نکلنے کی کوشش میں ہوں ' حالانکہ وہ صرف خوراک کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ تہ میں اگے جھاڑ جھنکاڑ ہولے ہولے سر ہلا رہے تھے۔ کونوں میں سبز سبز کائی کے اندھے ٹاپو تھے ' ایک طرف کو کنول کے پھولوں کا جمگھٹا سا تھا۔ جوہڑ کے گاؤں والی طرف بھینسوں کا غول کا غول پانی سے تھوتھنیاں باہر نکالے آنکھیں بند کئے مست پڑا تھا ' پورے کنارے پر لڑکوں کی بے شمار چھوٹی بڑی ٹولیاں مختلف کھیل بڑے جوش و خروش سے کھیلنے میں مصروف تھیں۔ جوہڑ کے درمیان میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا ' جس میں چھوٹی اینٹ اور چونے کی کائی سے سیاہ پڑتی ہوئی بڑی سی مٹی تھی۔ جو ماتا رانی کی سمادھ تھی۔ زندگی کے درمیان موت ہی کی طرح سے اٹل اور ہمہ وقت موجود موت کی ایک نشانی جو صدیوں سے وہاں کھڑی تھی۔

تسلوں میں مٹی بھرنے والی عورتوں سے ذرا ہٹ کر ایک لڑکا سب سے الگ

تھلگ بیٹھا ایک بڑے بھاری سوکھے لکڑ پہ چکنی مٹی سے بیل بنانے میں غرق تھا' تین چار بیل لکڑ پہ ایک قطار میں بنے رکھے تھے۔ سینگ 'کوہان' دم ہر تفصیل مکمل۔ تیز دھوپ میں پسینہ کے قطرے اس کی ناک سے ٹپک رہے تھے۔ مگر وہ بے خبر اپنے کام میں محو تھا۔

دونوں ماں بیٹی تسلوں میں چکنی مٹی بھر چکیں تو جوہڑ میں ہاتھ دھو کر تسلے وہیں چھوڑتی ہوئیں کپڑے دھوتی عورتوں کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

ایک نے پوچھا " بھاگو! برکھا کے دنوں میں کوٹھے لیپو گی کیا؟"

" اری نہیں چولہوں کو مٹی لگانی ہے۔"

" بھاگو نے پوچھا " کچھ پتہ چلا کہ ایشری کو کون مار گیا۔"

" ہائے ہائے بے چاری ایشری 'کیا خبر کون مار گیا اسے' وہ تو نہ کسی کی اچھائی میں تھی نہ برائی میں' بس سارا دن اپنے گھر میں بیٹھی رامائن کا پاٹھ کرتی رہتی' ہاں' دن میں ایک مرتبہ مندر ماتھا ٹیکنے ضرور جاتی' اسے کیوں قتل کر دیا کسی نے؟"

" یہ دھن بھی تو جان کا روگ ہوتا ہے' سنا ہے کہ اس کے پاس دس سیر سونا تھا اب خود سوچ لو' چاندی کتنی ہو گی۔ ہزاروں روپے نقد تھے' دولت لوٹنے کے بعد مار دیا کسی نے۔"

ایک عورت بولی " میں صبح پتہ چلنے پر ایشری کے گھر گئی تھی' وہاں بہت دنیا اکٹھی ہو رہی تھی' ڈاکوؤں نے صندوقوں میں سے ایک ایک چیتھڑا تک نکال کے دالان اور صحن میں بکھیرا ہوا تھا اور ان ریشمی کپڑوں کے ڈھیروں میں ایشری اوندھے منہ مری پڑی تھی' اس کے سفید بال خون میں لت پت تھے' ظالموں نے اس کا سر لاٹھیوں سے کچل کے رکھ دیا تھا۔"

" ماں ماں" بھاگو کی لڑکی بولی " ایشری وہی تھی نا بہت بوڑھی سی' جو لاٹھی ٹیک ٹیک کے چلتی تھی' اور اس کا بڑا اونچا پکا دو منزلہ گھر تھا' سندھو جاٹوں کے گھر کے قریب۔"

"ہاں وہی ...... اری یہ سیٹھوں کا اس گاؤں میں بہت بڑا گھر تھا' ہزاروں لاکھوں روپے کا ساہوکارے کا کام تھا' جب سرکار نے سود کا دھندا بند کرا دیا تو ان کا کاروبار بھی ٹھپ ہو گیا' ان کے سارے رشتہ دار گاؤں چھوڑ کر بڑے بڑے شہروں میں جا کر

بیوپار کرنے لگے ' لیکن ایشری اور اس کا پتی بوڑھے تھے ' اور کوئی اولاد تھی نہیں ' جس کے کارن شہر جاتے یہیں پڑے رہے ' آٹھ دس سال ہوئے ' بوڑھا مرگیا تو پھر ایشری اکیلی کہاں جاتی ' سنا ہے بوڑھے کا ایک بھتیجا ہے جو کسی شہر میں رہتا ہے ' بہت بڑا سیٹھ ہے ' اب بچا کھچا دھن سمیٹنے آوے گا۔"

ایک عورت کہنے لگی " ایشری کا نہ کوئی آگے تھا نہ پیچھے ' اس نے اتنا دھن کیا کرنا تھا ' اپنے ہاتھوں سے پن کر جاتی تو اگلا جیون ہی اچھا گزر جاتا۔ اگر ویسے مرجاتی تب بھی تو یہ دولت اس کے پتی کے بھتیجے ہی کو ملنی تھی ' اس کے کس کام آنی تھی۔ خواہ مخواہ میں جان بھی گنوائی۔"

"پن کرنا بھی تو ہر کسی کے کرموں میں نہیں ہوتا پورے گاؤں میں ایک شانتی نائن تھی جو کبھی کبھار اس کے گھر چلی جایا کرتی تھی وہ بھی کام کاج کرنے ' اسے کچھ دے دلا دیتی ہو تو پتہ نہیں۔"

"اری کہاں ' کبھی دو چار سیر دانے دے دیئے یا پرانا لتا اٹھا دیا ' تو وہ پن تو نہیں کہلاتا..... " ایک جوان سی عورت پوچھنے لگی ...

" ماسی ! ماتا رانی کی سمادھ پر دور دور سے لوگ اولاد کے لئے منتیں ماننے آتے ہیں۔ کسی کی آخر مانی جاتی ہو گی تبھی تو آتے ہیں ' ایشری نے اولاد کے لئے کچھ نہ کیا بوڑھی عورت نے اپنے اردگرد گیلا دوپٹہ لپیٹتے ہوئے کہا۔ " بیٹی اپنے وقتوں میں جو کچھ اس سے بن پڑا ہو گا کیا ہو گا ' کوئی بھلا کسر چھوڑتا ہے ' لیکن ماتا رانی ہر کسی کی منت تھوڑا ہی مان لیتی ہیں۔ ہاں ! ایک ڈھنگ ایسا ہے جو سنا ہے کبھی اکارت نہیں جاتا ' مگر وہ ہے بڑا کٹھن اور کٹھور ' اور ہر کسی کے بس کا بھی نہیں ' کوئی ایسا سیانا برہمن جس نے وِدیا سدھ کی ہوئی ہو ساتھ دینے کی حامی بھرے تو یہ برتا جا سکتا ہے ' اس کے بنا نہیں" بات کرتے کرتے بڑھیا نے اپنی چھوٹی بہو کو آواز لگائی

" اے بہو ' اے جیتو دیکھ تو میری سلوار کرتہ اب تک سوکھ گئے ہوں گے ' میں تو یوں بندھ کے بیٹھے بیٹھے تھک گئی۔"

جوان عورت اب بیقراری سے بولی ' " ماسی جلدی سے بتا وہ کیا ہے ' میرے بھائی کی شادی ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں ' بڑے جتن کئے مگر پتہ نہیں کیا بات ہے اب تک بھابھی کا پاؤں بھاری نہیں ہوا ' " ایک عورت جو پتھر کی سل پہ کپڑے

ڈنڈے مار مار کر دھو رہی تھی ' ہاتھ روک کر گلے کے انداز میں بولی " ایشری تو مر گئی ' پر اب تھانہ گاؤں میں آکر بیٹھ جائے گا ' پتہ نہیں کتنے مہینوں تک ہم پہ بھاری بنی رہے گی ' یاد نہیں جب شیر سنگھ اور رام سنگھ کے دھڑوں میں لڑائی ہوئی تھی اور دونوں طرف کا ایک ایک آدمی مارا گیا تھا ' تو چھ مہینے تک تھانہ گاؤں میں بیٹھا رہا تھا ' گھر گھر فاقے ہونے لگے تھے بڑے بڑے رانی خانوں نے مونچھیں نیچی کرکے اپنے اپنے بال بچوں کو اگلی فصل کے آنے تک دوسرے دیہاتوں میں سسرال کے ہاں بھیج دیا تھا" بڑھیا اس بات پر متوجہ ہو کر کہنے لگی "سچ کہتی ہے سنت کور ' مرنے والے کوئی ' مارنے والا کوئی اور بیچ میں گاؤں کے بے گناہ باسی پھر پس کے رہ جائیں گے ' دودھ کی بالٹیاں بھر بھر کے وہاں جائیں گی ' اور ہمارے بچے ایک ایک بوند کو ترسیں گے ' منوں کے حساب سے اناج گھروں سے نکل کر وہاں چلا جاوے گا ' انڈوں کے جھول اور مرغیوں کے ٹوکرے گھر گھر سے لٹ کر نمبردار کے ڈیرے پہنچا دے جائیں گے ' کام کرنے والے بیگاریں بھگتائیں گے ' کھڑی فصلیں بنا پانی سوکھ جائیں گی۔ اور تیار کو کاگ کوے نوچ لیں گے" جوان عورت بڑھیا کو مخاطب کرکے کہنے لگی "واہگورو سے خیر مانگیں ' کیوں بری باتیں منہ سے نکالتی ہیں ' پچھلی مرتبہ تو پورے گاؤں میں جھگڑا پھیلا ہوا تھا اس لئے تھانہ چھ مہینے بیٹھا رہا ' اب کے تو ایک اکیلی بوڑھی کو کسی نے چوری چھپے سے مار دیا ہے ' اس لئے بات لمبی نہ ہو گی۔ اور پھر جو کچھ ہونا ہے ' ہو کر رہنا ہے ' ہمارے فکر کرنے سے کیا ہوتا ہے ' ماں ! تو بس جلدی سے وہ ترکیب بتا دے ' جس سے میرے بھائی کے اولاد ہو جائے۔" بڑھیا بولی ' " اچھا بھئی جو ہو گا سو دیکھا جائے گا اور پھر جو سب کے ساتھ ہو گا وہ ہمارے ساتھ بھی ہووے گا۔ تو ! ترکیب سیکھ لے لیکن ایک بات بتادوں یہ تیرے یا تیرے بھیا کے کرنے کی ہے نہیں۔ اچھا خیر سن ' میں ان لڑکیوں جتنی رہی ہوں گی" بڑھیا نے گڈی کی شادی رچاتی لڑکیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ " ان دنوں ایشری گاؤں میں نئی نئی بیاہی آئی تھی ' بوڑھے جاگیردار کو جوان بیوی بیاہ کر لائے ہوئے بھی دو سال ہونے کو آئے تھے مگر اس کی اولاد کی آشا پوری نہ ہو سکی تھی۔ ایک برہمن نے جاگیردارنی کو بتایا کہ کوئی اپنے ماں کا اکلوتا بیٹا ہو ' اور میں اس کا جیون منتر پڑھتے ہوئے ماتا رانی کی سمادھ پر اپنے ہاتھوں بھینٹ کروں اور پھر تم اس کی لاش پر کھڑی ہو کر نہاؤ تو کبھی ہو

نہیں سکتا کہ تمہارے من کی اچھیا پوری نہ ہو ' جاگیردارنی نے کیا کیا کہ گاؤں میں ایک نند نامی چمار ہوتا تھا ' اس کا پانچ چھ سال کا اکلوتا بیٹا تھا ' اسے موقع پا کر اٹھوالیا بچہ ایسا مضبوط ہاتھ پاؤں کا کہ کیا بتاؤں ' اماوس کی رات آدھی گزری تو جاگیردارنی اور براہمن بچے کو پکڑے ماتا رانی کے سادھ پر پہنچ گئے ' براہمن نے منتر پڑھتے پڑھتے تلوار کا ایک ایسا وار کیا کہ بچے کا سرتن سے جدا ہو کر الگ جاگرا ' پھر بچے کی لاش کے اوپر کھڑے ہو کر جاگیردارنی نے اپنے بدن سے کپڑوں کا آخری تار تک اتار پھینکا اور اسی طرح پورے قد کھڑے کھڑے بنا کسی جھجک ' لاج کے اشنان کیا ' اس سمے براہمن منتر پڑھتا رہا ' جب جاگیر دارنی نہا چکی اور براہمن منتر پڑھ چکا تو جوہڑ کے کالے پانی سے پانچ سر باری باری ابھرے ' اور انہوں نے کہا ہم آرہے ہیں ...... ہم آرہے ہیں ' اور سچ مچ جاگیردارنی کے اوپر تلے پانچ بچے پیدا ہوئے ' چمار اور چمارن کچھ دنوں تک گاؤں کی گلیوں میں روتے پھرتے رہے ' کسی نے ان کی نہ سنی ' پھر گم سم سے ہو گئے ' اور چھ مہینے کے اندر اندر دونوں مر گئے ' اب بتا ! تیری بھاوج اور بھائی یہ ہتیا چار کر سکتے ہیں ؟ اور آج کے زمانے میں ایسا ودوان براہمن کہاں سے ملے گا ؟ "

" نا ' بابا ' نا ایسی اولاد سے بنا اولاد ہی بھلے ' ہم کون سی جاگیروں والے ہیں ' جو اولاد نہ ہوئی تو وہ خالی رہ جائیں گی۔ "

بھاگو نے بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا " اٹھ نی پریتو چلیں۔ ان کی باتیں سنتی رہیں تو ہمیں شام پڑ جائے گی۔ "

بھاگو نے پریتو کو تسلا اٹھوایا اور وہ کمر لچکاتی گھر کی جانب چل پڑی ' خود ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی اسے بھی تسلا اٹھوائے تو مٹی کے بیل بنانے والا لڑکا نظر پڑا ' اس نے چھ مختلف ڈیل ڈول کے بیل بنا کر لکڑ کے اوپر سجائے ہوئے تھے۔ اور ساتواں بنانے میں محو تھا ' بھاگو نے آواز دی " بگو ! ذرا تسلا اٹھوادے۔ " وہ بھاگو کی آواز سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے کام میں غرق رہا ' وہ غصے میں بولی " ابے آتا ہے یا آکر لگاؤں تیرے ایک " بگو کام چھوڑ کر ایک دم اٹھا اور دوڑتے ہوئے جا کر سرعت سے اسے تسلا اٹھوا کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا ' بھاگو بولتی ہوئی جا رہی تھی " سیدھے سبھاؤ کو تو اس دنیا میں کوئی مانتا ہی نہیں۔ "

لڑکیاں کچے پکے چاول ہتھیلیوں پر رکھے مزے لے لے کر کھا رہی تھیں' ایک لڑکی بتانے لگی۔ "پتہ ہے سمادھ کے اردگرد پانی پاتال تک گہرا ہے' پاتال میں ماتا رانی کا بہت بڑا محل ہے' جہاں وہ سونے کا تاج پہن کر سونے کے تخت پر بیٹھی ہوتی ہیں اور دیولوک کی اپسرائیں انہیں چوری جھلاتی ہیں جیسے گوردوارے میں گرنتھ صاحب پہ جھلاتے ہیں۔وہ ستی ساوتری تھیں۔ اسی لئے پرلوک میں ان کی اتنی مہما ہوتی ہے۔

(۱)

لڑکیوں نے پوچھا۔ "وہ ستی کیونکر ہوئی تھیں۔"

"لو سنو بہت پرانے زمانے میں ہمارے گاؤں پر ایک راجہ راج کرتا تھا' اور ماتا رانی اسی راجہ کی رانی تھی' راجہ اور رانی میں بہت پیار تھا' ایک دن یوں ہوا کہ راجہ وزیر کو ساتھ لئے جنگل میں شکار کھیلنے نکل گیا' راجہ اپنے دھیان لگا شکار کا پیچھا کر رہا تھا کہ وزیر کے دل میں۔۔۔ بے ایمانی آگئی' اور راج پاٹ ہتھیانے کے لالچ میں ایک تیر تاک کے راجہ کی پیٹھ میں ایسا مارا کہ چھاتی کے پار نکل گیا' اور راجہ وہیں گھوڑے سے گرا اور مر گیا' رانی کو پتہ چلا تو ایک گھوڑے پہ خود سوار ہوئیں اور دوسرے گھوڑے پر دس بارہ برس کے راجکمار کو سوار کر کے ساتھ لیا اور محل سے باہر گاؤں والوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ وزیر تو آدھرمی ہوا جس راج اور راجہ کی رکھشا اسے اپنا خون دے کر کرنی تھی' اسی راجہ کے خون میں اس نے اپنے ہاتھ رنگ لئے اور راج کے درپے ہوا' تم میرا ساتھ دو تو میں پرتگیا کرتی ہوں کہ آج شام ہونے سے پہلے پہلے ان تینوں کاموں کو نپٹادوں جنہیں نپٹانا اب میرا دھرم ہے' پہلے تو وزیر کا سر اڑا کے راجہ کے خون کا بدلہ لوں' دوسرے راجکمار کو تلک لگا کے اس کے پتا کے سنگھاسن پر بٹھاؤں اور تیسرے راجہ کی دیہہ کے ساتھ اسی چتا میں جل کے ستی ہو جاؤں کیونکہ اس کے بنا جینا میرے بس سے باہر ہے' ہزاروں لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ "ہم آپ کے ساتھ ہیں" اور جو جس کے ہاتھ میں آیا لے کر رانی کے پیچھے پیچھے چل پڑا' ہٹ کی پکی رانی نے وہی کیا جو اس نے کہا تھا' دوپہر ڈھلنے تک وزیر کو مار کے اس کی لاش کو کتوں' کوؤں کو ڈالا اور راجہ کی ارتھی اٹھوا کر محل میں لائی' برہمنوں کو بلوا کر بیٹے کو سنگھاسن پر بٹھلا کر راج تلک لگوایا اور سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے مردہ راجہ کا سرگود میں رکھ کر ستی ہونے کے لئے

چتا میں بیٹھ گئی ' ساری پرجا ' درباری ' پروہت ' برہمن اور نیا راجہ سامنے ہاتھ باندھے
کھڑے تھے ' اور بنتی کر رہے تھے کہ ابھی راج اور راجہ کو آپ کی رکھشا کی ضرورت
ہے ' آپ ستی نہ ہوں ' رانی نے کسی کی ایک نہ سنی اور راجہ کو حکم دیا کہ چتا کو آگ
دکھاؤ ' اس کی کیا مجال تھی کہ حکم نہ مانتا۔ پل بھر میں شعلے آسمان کو چھونے لگے '
دیکھتے دیکھتے دونوں کی کایا جل کے راکھ کی ایک ایسی ڈھیری بن گئیں کہ ایک کی راکھ کو
دوسرے سے الگ نہ کیا جا سکتا تھا ' جس جگہ اب سمادھ ہے وہیں پہ وہ چتا تھی ' جس
میں زندہ رانی مردہ راجہ کے ساتھ ستی ہو گئی تھی ' نئے راجہ نے اپنے ماتا پتا کی راکھ
اور پھول وہیں اکٹھے کر کے دبا دیئے اور اوپر سمادھ بنا دی ' حیرانی کی بات ہے کہ سمادھ
تو دونوں راجہ اور رانی کی ہے ' لیکن کہلاتی ماتا رانی کی سمادھ ہے ' راجہ کا تو کوئی نام
بھی نہیں لیتا ' اب بھی ہر مہینے اماوس کی رات جب ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے ' تو
ماتا رانی تخت پر بیٹھی پاتال سے اپنی سمادھ پہ آتی ہیں ' اس لمحے اتنی روشنی ہوتی ہے '
جانو دن ہو گیا ہو ' پھر وہاں پاروتی جی آتی ہیں ' ماتا رانی ان کے پاؤں چھو کر پرنام کرتی
ہیں۔ وہ آشیرواد دے کر سورگ لوٹ جاتی ہیں اور ماتا رانی تخت پر بیٹھی واپس پاتال
میں اتر جاتی ہیں"

وہ بات سنا چکی تو لڑکیاں پھر چاولوں کی طرف متوجہ ہوئیں ' ایک لڑکی کہنے لگی۔
" اب کے اماوس کی رات آوے گی تو میں پوری رات جاگ کر دیکھوں گی کہ کیا ہوتا
ہے" کہانی سنانے والی لڑکی بولی ' " اری ! یہ سب کچھ ہر کسی کو دکھائی نہیں دیتا ' میری
ماں کہتی تھی کہ میری نانی نے بھی یہ سب ایک بار دیکھا تھا ' پتہ ہے میری نانی ہر
وقت جپ جی صاحب کا پاٹھ کرتی رہتی تھی اور ساری پوڑیاں زبانی یاد تھیں وہ پوری
رات سوتی نہیں تھی ' بس پاٹھ کرتی رہتی تھی گورو نانک دیو جی مہاراج نے اسے
سپنوں میں درشن بھی دیا تھا۔ " لڑکیاں ایک بار پھر حیرت و استعجاب میں ڈوب گئیں۔

پانچ سپاہی پیدل اور ایک تھانیدار گھوڑے پہ سوار وردیاں پہنے جوہڑ پہ نمودار
ہوئے تو پورا ماحول ٹھٹھک کے رہ گیا ' جو چیز جہاں تھی وہی رک گئی ' حتیٰ کہ پرلے
کنارے پہ چلتے ہل ٹھہر گئے ' اور ہالی جوتیں چھوڑ کر ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر اور پنجے
اٹھا اٹھا کر اس کنارے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ تھانہ پھر اسی سج دھج سے گاؤں
میں داخل ہو رہا تھا ' جس سج دھج سے پہلے کئی بار داخل ہو چکا تھا اب پھر وہی سب

کچھ ہو گا جو پہلے کئی بار ہو چکا تھا ' فصلوں کے بیچ سے نکل کر وہ چھیوں لڑکیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے جوہڑ کے کنارے کنارے چلنے لگے ' ان کی پر تمکنت چالیں مدہم تھیں ' اور معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کہیں پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی ' ڈری ڈری آنکھوں سے لڑکیاں ان کے منہ تک رہی تھیں ' وہ جانتے تھے کہ انہیں دیکھ کر جوہڑ پہ موجود ہر انسان کی آنکھوں سے خوف ٹپکنے لگا ہے ' وہ خاموش تھے ' کسی کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے ' کسی کو گھور نہیں رہے تھے کسی سے بات نہیں کر رہے تھے کوئی چیز بظاہر ان کی توجہ کا مرکز نہ تھی مگر سہم کا تیندوا تھا کہ ہر جانب اس کی لمبی ٹانگوں نے انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا ان وردی پوشوں کے سامنے ہر کوئی بلا جرم کئے اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا ' اور یہی وہ چاہتے تھے ' جب تھانیدار اور سپاہی عورتوں کے پاس سے گزر کر آگے نکل گئے تو سنت کور نے کہا "لو! آگیا تھانہ تم سب کو دیر سے اسی کا انتظار تھا نا" جوان عورت آہستہ سے بڑھیا کے کان میں کہنے لگی۔
" ماسی! یہ وہ تھانیدار تو نہیں جو پچھلی مرتبہ آیا تھا ' یہ تو کوئی اور ہے اس سے بھلا مانس دکھائی دیتا ہے۔"

" اری! ان کی پہچان شکل نہیں ' وردی ہوتی ہے ' کیا بھلا مانس کیا شیطان ' جو بھی وردی پہن لیتا ہے ویسا ہی بن جاتا ہے ' جیسے دوسرے وردیوں والے ہوتے ہیں ' ابھی دیکھنا اس بھلے مانس کے ہاتھوں نمبردار کے ڈیرے سے کیسی کیسی چیخ و پکار بلند ہو گی۔ " " ہائے ماسی نہ! اب کے تو کسی کو مارپیٹ نہ کریں ' پاپ تو کسی ایک نے کیا ہو گا اور یہ ماریں گے اور بے عزت کریں گے ہر کسی کو ' جوان کے ہاتھ لگ جائے گا ' پتہ نہیں ایشری کو کون چور ڈاکو تھے جو مار گئے ' گاؤں والے بے چاروں کا اس میں کیا دوش ' وہ بھلا کیا کر سکتے تھے۔"

" نہیں بیٹی! گاؤں والوں کا دھرم تھا کہ ایشری اور اس کے گہنوں کی رکھشا کا اوپا کرتے ' ہمیں کیا پتہ نہیں تھا کہ ایک اکیلی عورت اتنے سونے روپا کے ساتھ سونے ڈھنڈار مکان میں تن تنہا پڑی رہتی ہے ' اس کو کوئی لوبھ میں آکر مار دے گا اور یہی ہوا ' دھرم کی رکھشا تو بیٹی جان دے کر کی جاتی ہے جیسے ماتا رانی نے کی تھی سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے وزیر کو مارا ' بیٹے کو سنگھاسن پہ بٹھایا اور پوری پرجا کے سامنے ہرنیگ نمنا کرتی کی دیمہ کے ساتھ ستی بھی ہو گئی یوں ہوتا ہے دھرم کا پالن اور ہم

ابھی تک یہی نہیں سمجھ پائے کہ ہمارا دھرم ہے کیا تو اس کا پالن کیا کریں گے بس اسی طرح تھانہ آتار رہے گا ' جاتا رہے گا اور ہم خاموشی سے بھوگتے رہیں گے ' ماتا رانی کی کالی سمادھ ہمیشہ کی طرح خاموش تھی ' لڑکے پہلے تو جہاں جہاں کھڑے تھے اپنا اپنا کھیل چھوڑ کر وردی پوشوں کو غور سے دیکھتے رہے پھر مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے سدھے ہوئے جانوروں کی طرح چل پڑے ' عورتیں ان سوکھے کپڑے ہی پہن کر پھرتی سے اپنی چیزیں سنبھالنے میں لگ گئیں ' لڑکیاں گھروں کے رخ بھاگیں ' بیل بنانے والے لڑکے نے ہاتھوں سے مٹی اتارتے ہوئے ایک نظر اپنے بیلوں پہ ڈالی اور وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

چرواہے بھینسیں ہانک ہانک کر جوہڑ سے نکالنے لگے ' وردی والوں کی راہ میں بھینسوں کا غول آگیا تو چرواہے نے گھبراہٹ کے عالم میں لاٹھیاں برسا برسا کر آدھی بھینسوں کو گاؤں کی طرف بھگایا اور آدھی کو واپس جوہڑ میں دھکیل دیا ' تاکہ وردی والوں کے لئے راستہ جلدی صاف ہو ' یکدم بڑی تیز ہوا اٹھ کھڑی ہوئی لہریں کناروں سے ٹکرانے لگیں ' کیکر کے درخت کھنچتی کمانوں کی طرح دوہرے ہونے لگے کالی گھٹائیں دوڑی چڑھی آرہی تھیں اور منٹوں میں پورے آسمان پہ چھا گئیں وردی والے اور ان کے پیچھے پیچھے چلے جاتے لڑکے پورے جوہڑ کی لمبائی طے کر کے گاؤں کے اندر کی طرف مڑ چکے تھے پورا ماحول اب انسانوں سے خالی تھا گڑیا کا انگلی بھر سرخ سالو لہروں پہ اچھل رہا تھا ' جیسے خون کا دھبہ ہو ' مٹی کے ساتھ بیل جو دم ' کوہان اور سینگوں سے ہر طرح مکمل تھے کسی پناہ کے بغیر برستی بارش میں ڈھلتے ڈھلتے صرف مٹی کے ساتھ تودے رہ گئے تھے ' زندگی سے بھرے جوہڑ کے درمیان موت کی ایک نشانی ماتا رانی کی کالی سمادھ کھڑی تھی اسے شاید پھر کسی چمار کے صحت مند بیٹے کے خون کا انتظار تھا۔

سیاہ آسمان

اندھیری سیڑھیاں پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کے چڑھتے چڑھتے دم پھول گیا تو سانس بحال کرنے کے لئے دیوار کا سہارا لے کر رک گیا ۔ اور ہاتھ یونہی غیرارادی طور پر سر کے اردگرد کسے لوہے کے کڑے کو چھونے لگا ۔ میں اسی بلڈنگ میں باقس کے فلیٹ پر پہلے ہزار مرتبہ آچکا ہوں مگر پہلے نہ تو سیڑھیاں کبھی اتنی اندھیری پائیں اور نہ اس قدر لق و دق خالی ۔ یوں ہوا کرتا تھا کہ یہی کوئی بیس پچیس سڑھیاں چڑھے ' ایک گیلری سی میں سے گزرے اور سامنے اس کے فلیٹ کا روشن دروازہ کھلا ہوتا تھا

آج اب تک اغلباً" کوئی دو سو سیڑھیاں تو چڑھ چکا ہوں گا ۔ مگر نہ وہ گیلری آئی نہ کہیں کوئی روشن دروازہ نظر پڑا ۔ اس بلڈنگ میں اتنے بہت سے آباد فلیٹ ہیں ۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آج نہ کوئی اوپر جا رہا ہے اور نہ نیچے آرہا ہے ۔ کیا یہ وہی بلڈنگ ہے ؟ بلڈنگ تو بہر حال وہی ہے ۔ تو پھر اس کے باسی نقل مکانی کرکے کہیں چلے گئے ہوں گے ۔ باقی باسی تو خیر فانی انسان ہیں کسی خطرے کی بو سونگھ کر بھاگ لئے ہوں گے ۔ مگر باقس تو ایک دیوتا ہے ' امر ' ازلی ' ابدی اسے ان خطروں سے کیا خوف ۔ وہ جب چاہے ایک لمحے میں سورگ نکل جائے اور جب چاہے اس لوک میں لوٹ آئے ۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے فلیٹ تک جانے والی سیڑھیاں آج یک دم یوں لمبی کھنچ گئی ہیں ۔ جیسے ربڑ کا غبارہ پہلے تو محض ایک ذرا سا چھچھڑا ہوتا ہے ۔ جب کوئی بچہ اس میں ہوا بھرنا شروع کرتا ہے تو حیران کن حد تک لمبا ہوتا چلا جاتا ہے ۔

ان سیڑھیوں پہ ضرور کسی نے ایسا ہی کوئی عمل کیا ہے۔ اب وہ طفل نادان معمول کے مطابق دوہرا ہو ہو کر زور لگاتا ہوا اس میں اپنی گندی سانس ٹھونستا جائے گا حتیٰ کہ غبارہ بھک سے اڑ جائے گا اور یہ سیڑھیاں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی اس کے بعد انسان کبھی اوپر نہ جا سکیں گے اور وہ طفل نادان اداس چہرہ لئے گھر چل دے گا۔ میں اس اندھیرے اور تنہائی میں یوں کھڑا تھا جیسے لحد میں پڑا مردہ اور حیرانی کی بات ہے کہ میں اسی کی طرح اپنی تنہائی سے بے خبر بھی تھا۔ وہ اپنے کفن میں مگن ہوتا ہے۔ میں اپنے اندھیرے میں مگن تھا۔ سانس قدرے درست ہوا تو پھر بازو پھیلا کر دونوں دیواروں کا سہارا لیتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کہاں گئی وہ منزل جہاں باقس رہتا تھا۔ روتی ہوئی وائلنوں اور آہیں بھرتی ہوئی گٹاروں کی آواز دور بہت دور اوپر کہیں سے آ رہی تھی۔ ان کی لے سے ہٹ کر ایک بہت بے ہنگم' بے تال دھم دھم کی آواز بھی آ رہی تھی۔ یہ آوازیں سن کر مجھے ایک یقین تو ہو گیا کہ وہ کھلنڈرا ہمیں مدعو کرنا بسرا کر خود سورگ نہیں نکل گیا۔ اسے دعوت دینا یاد رہا ہے۔ اور وہ اسی بلڈنگ میں اپنے فلیٹ میں موجود ہمارا منتظر ہے۔ یہ اتنی بے ہنگم دھم دھم کی آواز کیا ہے؟ ڈرم ہو گا۔ نہیں اتنا بے تالا نہیں ہو سکتا کیا باقس سر شام اتنا مدہوش ہو گیا کہ ناچنے بھی لگا؟ کیا اس نے مہمانوں کا انتظار کئے بغیر پینا شروع کر دیا ہو گا؟ خیر! پینا تو وہ ہر وقت رہتا ہی ہے۔ لیکن کیا وہ باقس جس کے ناچ کے اثر سے بے سرے ساز خود بخود سر ہو جاتے ہیں ناچ کے نام پر بے ہنگم طور پر کود رہا ہو گا؟ ہر گز نہیں' یہ کوئی اور ہی آواز ہے' جو یقیناً" کسی اور جگہ سے آ رہی ہے۔ اس کا فلیٹ قطعاً" ایسی غلیظ' ننگی اور فحش آواز کا منبع نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے میرے سوا باقی سب جمع ہوں اور انہوں نے سوچا ہو کہ کیا پتہ وہ پہنچ بھی پاتا ہے یا نہیں اور زندگی نے اصرار کیا ہو کہ دیر مناسب نہیں رسومات شروع کر دو اور انہوں نے شروع کر دی ہوں۔ زندگی تو اپنی بے وفائی میں ویسے بھی ضرب المثل ہے۔

دونوں طرف دیواریں میرے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں اور درمیان میں پڑی پیچ در پیچ سیڑھیاں اوپر ہی اوپر چلی جا رہی تھیں کہیں کسی رخ ان سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا تو چل ہی رہی تھی۔ مگر دفعتاً" ایک تیز جھکڑ اندھیری سیڑھیوں میں شاں شاں کا شور کرتا یوں گزرنے لگا کہ

میرے قدم اکھڑ سے گئے اور بڑے کوٹ کے دونوں پٹ کسی اڑتے ہوئے بڑے پرندے کے پروں کی طرح ہوا میں تن گئے۔ ان سیڑھیوں میں کوئی اڑ تھوڑا ہی سکتا ہے یہ جعلی طور پرتنے ہیں اس لئے میں نے انہیں زور سے کھینچ کر اپنے کپکپاتے بدن کے اردگرد لپیٹتے ہوئے جلدی سے بٹن بند کر لئے۔ سردی جو پچھلے کئی مہینوں سے بڑھتی جا رہی تھی۔ اب بہت بڑھ گئی تھی۔ مگر اس جھکڑ نے چل کر تو گویا کہ زمہریر میں پہنچا دیا۔ میں نے اپنے سر کے اردگرد کسے لوہے کے کڑے کو ہاتھ لگا کے دیکھا وہ اب بھی اتنا تنگ اور سرد تھا کہ میرے سر اور ماتھے کی کھال کے اندر گھسا جا رہا تھا دھاتیں سردی سے سکڑ جاتی ہیں نا۔ اسی لئے شاید اور تنگ ہو گیا تھا۔ اس شہر میں جب سے یہ ان دیکھی اور ان جانی سردی پڑنی شروع ہوئی تھی۔ ہر زن و مرد کے سر کے اردگرد خدا معلوم کیوں اور کیسے لوہے کے کڑے خود بخود کسے گئے جو روز بر روز تنگ سے تنگ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بچوں کے سروں پر تو لوہے کے پورے پورے خود کس گئے ہیں اور نومولود تو خیر اب پیدا ہی خودوں سمیت ہوتے ہیں اگرچہ ابھی تک ان کڑوں کے سبب کوئی انسانی موت واقع نہیں ہوئی تاہم اطلاعات ملی ہیں کہ کئی لوگوں کے کڑے اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ انہیں ہسپتالوں میں داخل کرانا پڑا ہے اور ان میں سے چند ایک کے کڑے تنگ ہوتے ہوتے اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ اندیشہ ہے کہ کسی لمحے ان کی کھوپڑیاں تڑخ جائیں اور بھیجے باہر ابل پڑیں۔ کوئی ڈاکٹر یا سائنس دان اس آفت کے اسباب و علاج ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کر رہا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ جو لوگ کڑوں کے تنگ سے تنگ ہونے کی شکایت کرتے ہیں دراصل ان کی کھوپڑیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور وہ ایک لا علاج مرض ہے البتہ اس کے سد باب کے طور پر فطرت نے خود راہ تلاش کرلی ہے اور بچوں کے سروں پر مکمل خود چڑھ گئے ہیں۔ آئندہ پندرہ بیس سال بعد انشاء اللہ کسی کو لوہے کے کڑوں کی تنگی کی شکایت نہ رہے گی۔ کیونکہ اس وقت تک ہر شکایت کرنے والے کا بھیجا تڑخی ہوئی کھوپڑی میں سے ابل کر خارج ہو چکا ہو گا یہ تو حکماء کی رائے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مخلوق خدا اذیت میں مبتلا ہے۔

میں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے جب دوبارہ بے حال ہو گیا تو یہ جاننے کے لئے کہ میں ابھی فلیٹ سے کتنی دور ہوں، میں نے پوری توجہ سے کان لگا کر وائلنوں اور

گٹاروں کی آواز سننے کی کوشش کی ' آوازیں اتنی ہی مدہم تھیں جتنی پہلے ' مگر اب خلاف توقع نیچے سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور وہ دھم دھم کی بے ہنگم بے ہودہ آواز بھی ابھی تک آ رہی تھی ۔ اور وہ بھی نیچے سے ہی آتی محسوس ہو رہی تھی تو میں بہت اوپر نکل آیا ' سیڑھیاں اترنے سے پہلے دم لینے کے لئے وہیں بیٹھ گیا ۔ میں ان سیلی اندھی سیڑھیوں میں بہت دیر تک بیٹھا کپکپاتا سانس درست کرتا رہا ۔ مجھے رنج آ رہا تھا کہ اس بلڈنگ میں اتنے بہت سے فلیٹ ہیں اور ان میں اتنی بڑی تعداد لوگوں کی رہتی ہے اگر یہ لوگ سیڑھیوں میں تھوڑی سی روشنی کا انتظام کر لیں تو کیا ہرج کی بات ہے مگر وہاں تو کسی کھڑکی ' روشن دان ' دروازے کی دراڑ میں سے بھی روشنی نہیں آ رہی تھی ۔

" تمہیں پتہ نہیں جب سے کڑے کسے گئے ہیں ۔ روشنیاں بند کر دی گئی ہیں ۔ تم نے کسی سڑک ' گلی ' کوچے میں روشنی دیکھی ہے ؟ کسی مکان ' دوکان میں روشنی دیکھی ہے ؟"

غیر متوقع طور پر اپنے قریب یہ آواز سن کے میں گھبرا کے بولا " تم کون ہو ؟"

میرا نام مسعود تھا ۔ اب میرا نام نامسعود ہے ۔

" تم یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

" جو تم کر رہے ہو"

" میں تو پچھلے کئی گھنٹوں سے باقس کے فلیٹ کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں ۔ اس نے آج شام کے لئے مجھے بلایا تھا"

" میں بھی اسی کے فلیٹ کی تلاش میں ہوں ' مجھے بھی اس نے بلایا تھا ۔ شاید جسے ہم سیڑھیاں چڑھنا سمجھتے رہے ہیں وہ اصل میں سیڑھیاں اترنا تھا ہم نیچے کہیں تحت الثریٰ کے نزدیک ہیں ... غور سے سنو ! سازوں کی آہ و بکا کی آواز جو صرف باقس کے فلیٹ سے ہی آ سکتی ہے ۔ کتنی بلندی سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ساتھ ہی ایک گندی دھمک کی آواز بھی چلی آ رہی ہے ۔"

" روشنی ۔" یہ کہتے ہوئے نامسعود ہنسا پھر کہا " ہم نے باہر سے بہت سا کالا پینٹ منگوایا ہے ۔ اتنا بہت سا کہ اس کے اوپر پھیلے ہوئے پورے آسمان پر ہم اس کو تھوپ دیں گے پھر نہ دن کو سورج نکلا کرے گا ۔ نہ راتوں میں چاند چمکے گا ۔ نہ

ستارے دکھیں گے ۔ دن رات یہ شہر ان سیڑھیوں کی طرح اندھیرے میں ڈوبا رہے گا۔

" ناسعود جو وقت ابھی نہیں آیا تو اس کے خیال سے مجھے کیوں ہراساں کرتا ہے۔"

" وقت ابھی نہیں آیا ؟ کیا بکتا ہے ۔ پینٹ پہنچ چکا ہے ٹھیکہ دے دیا گیا ہے کام شروع ہو ..."

" اچھا یہ سب ٹھیک ہے ۔ مگر لمحے کی بھی تو کوئی قیمت ہوتی ہے ۔ اس کو سمجھو اب جب کہ وہ آخری رہ گیا ہے تو اور بھی قیمتی ہو گیا ہے دل نہ مسوس ' بس جلدی کر ' باقس اگر ابھی زندہ ہے اور اس کا فلیٹ ڈھے نہیں گیا تو ہم آج اس کو تلاش کرکے رہیں گے ۔"

اس کے بعد پتہ نہیں کتنی مرتبہ ہم دونوں ان سیڑھیوں کی لامتنا ہی لمبائیوں میں اترتے چڑھتے رہے اس کا فلیٹ تو کیا ملنا تھا سیڑھیوں کا زمین پر پہنچنے والا سرا بھی غائب تھا ' ہم نے پوری طاقت سے دیواروں کو دھکے دیئے اور وہ اتنی ہی طاقت سے ہمیں پیچھے اچھال دیتیں ہم نے لوہے کے کڑوں میں کسے اپنے سروں کو ان سے پٹخا ۔ نہ تو کوئی دیوار پھٹی اور نہ ہی سیڑھیوں نے ہمیں کوئی راہ دیا ہمیں یقین سا ہو گیا کہ ہم دو چوہوں کی طرح دیواروں کے پنجرے میں دوڑتے دوڑتے تھک کے سیڑھیوں پر گر جائیں گے ۔ اور مر جائیں گے ۔ مگر بدستور بھاگم بھاگ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے ' اتر رہے تھے اور ہمارے دم سینوں میں سما نہیں رہے تھے ۔ میں نے تیزی سے سیڑھیاں اترتے ناسعود کا بازو پکڑ کر کہا " ذرا رکو ' آؤ ایک آخری کوشش کے طور پر دونوں مل کر پورے زور سے باقس کو پکارتے ہیں اگر اس نے ہماری آواز سن لی تو وہ آکر راہ سجھاتے ہوئے ہمیں اپنے فلیٹ میں لے جائے گا ۔"

میں نے ایک دو تین کہا اور تین پر ہم دونوں نے اپنی پوری جانیں مجتمع کرکے آواز لگائی۔

" باقس س س " تیز ہوا کی شاں شاں میں ہماری آواز غتر بود ہو گئی ۔ وقفے وقفے سے ہم نے دو تین بار اور پکارا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ ہم پر مایوسی چھا گئی ۔ اتنے میں چپ راست کی پر ہیبت تحکمانہ آواز پر بہت بھاری بھرکم بوٹوں کی ایک

تال میں رچی دھمک سے سیڑھیاں لرزنے لگیں۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ ہم خوف سے دبک کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے جب وہ مارچ کرتے ہوئے ایک ایک کر کے ہمارے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئے تو ہم دبے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے ایک جگہ جا کر "ہالٹ" کی آواز پر وہ سب رک گئے۔ حکم دینے والے شخص نے آگے بڑھ کر دروازہ یوں پیٹا کہ ہم سمجھے کہ دروازہ تیلی تیلی ہو کر بکھر جائے گا۔ وہ چنگھاڑا

"باقس دروازہ کھولو۔"

اندر سے باقس کی آواز آئی "تم کون ہو؟"

"ہم کوئی بھی ہوں۔ تم دروازہ کھولو۔ تم نے اندر روشنی کی ہوئی ہے۔"

"اندر کوئی روشنی نہیں۔ تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔"

"تم نے اندر زندگی چھپائی ہوئی ہے"

"یہاں کوئی زندگی نہیں"

"تمہارے کمرے سے سازوں کی سسکیاں سنی گئی ہیں"

"تمہیں بخوبی علم ہے کہ موسیقی کبھی کی مر چکی"

"تم دروازہ کھولو ہم تمہارے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"تمہیں میرے گھر کی تلاشی لینے کا کوئی حق نہیں' یہ میری چار دیواری ہے اور اس میں کسی اجنبی کو داخل ہونے کا اختیار نہیں۔"

"ہر خانہ خانۂ ما است کہ خانہ خدائے ما است" ہمیں تلاشی لینے کا پورا پورا حق اور اختیار ہے دروازہ کھول دو نہیں تو ہم اسے توڑ کر اندر داخل ہو جائیں گے"

"اگر تم دروازہ توڑو گے تو میں بندوق سے اس کی حفاظت کروں گا" پھر انہیں سناتے ہوئے بلند آواز سے اپنے ملازم کو آواز دی "مشرقی! اپنی بندوق لانا جو تو شرق میں چلایا کرتا تھا' اس کے بغیر یہ باز نہیں آئیں گے"

مشرقی نے اسی طرح بلند آواز میں جواب دیا "یہ لیجئے بندوق"

اس پر میں نے اور نا مسعود نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ ہمیں پتہ تھا کہ مشرقی اور باقس' دونوں کے پاس کوئی بندوق نہیں اگر انہوں نے دم نہ کھایا تو باقس مارا گیا۔

حکم دینے والے شخص نے کہا " باقس تو اچھا نہیں کر رہا تجھے پچھتانا پڑے گا کل ہم ڈائنامیٹ لے کر آئیں گے اور تیرے فلیٹ کو اڑا دیں گے پھر تجھے پتہ چلے گا۔"

" ٹھیک ہے لے آنا ' تب بات کریں گے "

وہ شخص اپنے دستے کو اسی طرح پریڈ کراتا ہوا واپس لے گیا۔

میں نے پوچھا " نا مسعود کیا باقس کی اس جرات پر تیرا کڑا بھی کچھ ڈھیلا پڑا" کہنے لگا "ہاں کوئی ہوا بھر فراخی محسوس تو ہوئی ہے۔"

ہم نے جا کر آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا ' باقس نے پردہ ہٹا کر ہمارے چہرے دیکھے اور دروازہ کھول دیا اندر واقعی روشنی تھی جو زندگی کی روتی ہوئی آنکھوں سے نکل نکل کر کمرے میں اجالا کر رہی تھی اور کمرے کے وسط میں گھٹنوں تک کٹی اگلی ٹانگوں والی بھینس نے ناچ کے نام پر کود کود کر ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ اچھا تو وہ غلیظ اور مکروہ دھمک کی آواز اس کے ناچنے کی تھی ' اس کی اگلی ٹانگیں کہاں گئیں ؟ اوہ یاد آیا نیچے جہاں سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں وہاں قصاب کی دوکان کی دیوار کی اوٹ میں ابلتے پانی کے ایک کنستر میں جو بھینس کی دو گھٹنوں تک کٹی ٹانگیں پڑی تھیں وہ اس کی تھیں اور انہیں وہاں اس لئے چھوڑ آئی تاکہ اس سردی میں ناچتے ناچتے کہیں شل نہ ہو جائیں اب یہاں سے فارغ ہو کر جب جائے گی ۔ تو نیچے پہنچ کر اپنی گرم گرم ٹانگیں اور پاؤں پہنے گی اور چل دے گی۔ مے سے بھرا خم کونے میں پڑا تھا۔ فقیر صحرا ' صوفی سیاہ پوش ' ستارہ گل مستانہ زہرا اور حتیٰ کہ باقس بھی ہاتھوں میں خالی جام پکڑے دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے کئی ٹانگوں والی بے تحاشا کودتی بھینس کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اسے روکنے سے قطعی قاصر تھے ہم بھی خالی جام ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں کی طرح دیوار کے ساتھ لگ کر اسے دیکھنے لگے ۔ زندگی ایک کونے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھی اپنی آنسو بہاتی آنکھوں سے صرف چھت کو تکے جا رہی تھی زندگی کو یوں زارو قطار روتے دیکھ کر میں سناٹے میں آگیا " زندگی میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں ۔ میرے بلانے پہ تو آج شام یہاں آئی اور تیری تذلیل ہوئی" اس نے کوئی جواب نہ دیا اسی طرح آنسو بہاتی رہی اور بھینس اسی طرح اودھم مچاتی رہی ۔

نا مسعود کہنے لگا ' "دوستو ! اس بھینس کو تو کمرے سے نکالنے کی کوئی تدبیر کی

ہوتی۔"

باقس نے جواب دیا "ہم سب تو اپنی سی کر چکے مگر یہ نہیں نکلتی، پہلے ڈنڈے مارے پھر آہیں بھرتی ہوئی موسیقی کو بند کیا اس کے بعد دروازے میں کھڑے ہو کر چارہ دکھایا لیکن یہ کسی طور مانتی ہی نہیں، بس اسی طرح کودے جاتی ہے اب تم آئے ہو کوئی چارہ کرکے دیکھو"

"باقس! تمہاری دیوتائی شکتی بھلا کس کام کی جو ایک اپاہج بھینس کو باہر نہیں نکال سکتی۔"

اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اقرار کیا "ہاں! میں تو صرف مے اور رقص کا دیوتا ہوں بھینس میرے بس میں نہیں"

"مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے اسے کتاب دکھا کر دیکھتے ہیں" یہ کہتے ہوئے ناسعود دوسرے کمرے میں دوڑتا ہوا گیا اور بہت سی کتابیں بازوؤں میں بھر کے لے آیا اس نے کچھ ورق پھاڑ کر اس کے سامنے کئے تو وہ کودنا بھول کر نہایت رغبت سے انہیں کھانے لگی وہ اسی طرح ورق پھاڑ پھاڑ کے کھلاتا ہوا اسے کمرے سے باہر لے گیا پھر گھر کی ایک ایک کتاب لے جا کر ورق ورق کرکے سیڑھیوں میں نیچے تک پھیلا دی۔ وہ تیزی سے ادھر ادھر منہ مارتی ورق ورق چرتی نیچے اتر گئی۔ آں دفتر راگاؤ خورد و گاؤ راقصاب برد حالانکہ اس قصے میں قصاب گاؤ سے پہلے نپٹ چکا تھا ہم ناسعود کے بہت ممنون و مشکور تھے اس پہ واہ واہ کے ڈونگرے برسائے گئے کہ آخر اس کی تدبیر کی بدولت سب کی اس بے ہو وہ بھینس سے گلو خلاصی ہوئی۔

باقس نے خم کی طرف نظر بھر کے دیکھا اور آن واحد میں تمام خالی جام مے سے چھلک اٹھے افسردہ اور اور مایوس چہروں پہ مسکراہٹ کھل اٹھی اس نے جام بلند کرتے ہوئے زندگی کی طرف دیکھ کر جوش سے کہا "بنام زندگی" وہ کونہ جہاں بھرپور جوان زندگی چھت کو تکتی ہوئی آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی۔ اب بھائیں بھائیں کرتا خالی پڑا تھا، ہم سب نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر زندگی کا کہیں کوئی سراغ نہ تھا۔ اگر نور جاموں سے منعکس نہ ہو رہا ہوتا تو پورا کمرہ تاریکی میں ڈوب چکا ہوتا۔ باقس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچا ہو گیا اور وہ اس شدید صدمے سے سنبھلنے کے لئے دیوار سے کمر لگا کر، خاموش گردن نیچی کئے کھڑا اپنے غم میں ڈوب گیا سب پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا

"تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ" کچھ دیر کے بعد باقس سنبھلا اور کہا "جس کی خاطر یہ سب کیا دھرا تھا وہ تو چلی گئی۔ اب بولو دوستو"

فقیر صحرا نے کہا "باقس یوں لگتا ہے جیسے میری آتما کا انت مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پہ جا کر برف کا تودہ بن گیا ہو وہاں سے نہ کبھی برف پگھل سکتی ہے اور نہ کبھی میری آتما کا انت واپس لوٹ سکتا ہے تم جانتے ہو میں تو فانی ہوں۔ سورج کے سوا نیزے پہ آنے کا کہاں تک انتظار کر سکتا ہوں"

صوفی سیاہ پوش نے کہا "ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ ہوتا ہے جو اس کے اندر مرتے دم تک زندہ رہتا ہے اور یوں اس کے خمیر میں معصومیت اور حیرت کے عنصر کو قائم رکھتا ہے میرے اندر وہ ننھا بچہ اب مر گیا ہے اور اس کا زہر اتنا پھیل چکا ہے کہ آہستہ آہستہ میری روح کے اندر سرایت کرتا محسوس ہو رہا ہے"۔

مستانہ زہرہ بولنے لگا تو اس کی آواز اس انداز میں نکل رہی تھی جیسے کوئی عالم نزع میں بولنے کی کوشش کر رہا ہو "میں تو سانس بھی کانوں کے راستے لیتا تھا۔ اب ان میں سیسہ بھر دیا گیا" ستارہ گل نے کہا "سینکڑوں صدیوں کے صرف سے میں نے جو مسکرانے کا فن سیکھا تھا۔ وہ میرے ذہن سے اب قطعی ماؤف ہو گیا ہے۔ میں محض پتھر کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہوں جو نہ روتا ہے نہ ہنستا ہے گلنار علم میرے ہاتھ سے گر کر کہیں صحراؤں کی ریت تلے دب گیا ہے اگر زندگی ہمیں سینکڑوں صدیاں پیچھے پھینک گئی ہے تو ہمیں واپس آنے میں چند صدیاں تو ضرور لگیں گی۔ اگر میں نہیں ہوں گا تو کیا ہوا جب زندگی مہربان ہو گی تو کوئی اور آئے گا اور ریت میں سے میرا گلنار علم نکال کر پھر کندھے پر رکھ کر آگے بڑھے گا"

باقس نے کہا "دوستو اپنے اپنے جام بنام زندگی خالی کرو اور پھر بھرو اور لنڈھاتے چلو میں زندگی کو پہلے بھی کئی بار اپنے پرستاروں سے مایوس ہو کر روٹھ کر جاتے دیکھ چکا ہوں۔ ثابت قدم رہو' وہ واپس آئے گی اور ہم اس کی شان میں بہت بڑا جشن کریں گے۔ مجھے پتہ ہے آسمان پہ تھوپے جانے والا سیاہ پینٹ آخر پگھل کر گر جائے گا روشنی کے آگے بند باندھنے کی یہ اولین کوشش تو نہیں پہلے بھی بہت لوگ کر چکے ہیں نور کے سیلاب کے آگے ہر رکاوٹ پر کاہ کی مثل بہہ جاتی ہے تمہارے سروں کے گرد کسے ہوئے آہنی کڑے کوئی ہمیشہ قائم تو نہیں رکھ سکتا؟"

ہم سب یک زبان ہو کر پکارے "تب تک کیا کریں"

"بتایا جو ہے۔ جام روشن رکھو" اس نے نہایت متانت سے جواب دیا پتہ نہیں وہ باقس تھا کہ میوز تھی کہ دونوں تھے۔

ایک شاخ نہال غم

تیس برس کتنے ہوتے ہیں ؟ گنو تو بہت ' سوچو تو گرمیوں کی ڈھلتی راتوں کے خاموش سناٹوں میں سروں پہ سے شاں سے گزر جانے والے پرندے کی بس ایک شاں۔ آج شام بہت اداس ہے۔ لیکن آج کی شام بھی تو۔بالکل عام شاموں جیسی ہے۔ سورج کی تیز گرم کرنیں دن بھر دھرتی اور اس کے باسیوں کو نہایت بے دردی سے جھلساتی رہی ہیں۔ اب وہ پچھم میں اتر گیا ہے تو زمین اور درختوں نے سکھ کا سانس لیا ہے اور اس سانس کا نم اور گرم بھبھو کا بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑے ہوئے کے چہرے سے کھیلتا ' کمرے کی فضا میں پھیلتا جاتا ہے۔ تیزی سے رنگ بدلتے آسمان کے نیچے کالے کالے پرندے زور زور سے پر مارتے ہوئے اپنے آپ کو کہیں اڑائے لئے جاتے ہیں۔ میرے سامنے کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں عمودی گڑی ہیں اور اس کے بعد جالی ہے۔ کھڑکی کے نیچے شہتوت کے پست قد مگر گھنے اور گتھے ہوئے درخت پر چڑیاں خوب زور سے شور مچاتی مچاتی ابھی ابھی سو گئی ہیں۔ کبھی کوئی ہلکی سی چوں سنائی دے جاتی ہے۔ شاید کسی چڑی نے بھی تیری طرح اپنے ساتھی کی چھاتی پہ سر رکھ کر جھوٹ موٹ کہا ہو گا۔

سیٹی مار سجناں بھل گئی موڑتے آکے

تو اب وہ سیٹی بجا رہا ہے کہ اس کی بھولی بھلکڑ سجنی اس کی سیٹی کی روشنی میں موڑ کی بھول بھلیاں کاٹ کر آسکے۔ آج شام کیوں اتنی اداس ہے ؟ سڑک پر پڑا

باندھے کھڑے چمکدار سبز رنگ والے ' بلند و بالا درخت اب گالا گالا گرتی سیاہی کے
تلے خموشی سے دبتے چلے جا رہے ہیں۔ان کے پیچھے نیلاہٹ مائل ملگجا آسمان اندھیروں
کے خلاف ازل سے ہاری ہوئی جنگ ابھی تک بہادری سے لڑے جا رہا ہے ایک دن
آئے گا کہ یہ سیاہیاں جو گالا گالا باہر گر رہی ہیں میری آنکھوں کے اندر گرنے لگیں
گی۔درخت اسی طرح سیاہیوں کے تلے دبتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ فقط درختوں کے
ہیولے باقی رہ جائیں گے اور پھر آہستہ آہستہ وہ ہیولے بھی پگھل پگھل کے اندھیروں
میں مل کر اندھیرے بن جائیں گے میرا آسمان اندھیروں کے خلاف جنگ ہار کر سرنگوں
بیٹھ جائے گا۔وہ نقش جو سب سے آخر میں میرے ذہن سے محو ہو گا وہ سردیوں کی
ایک شام میں اناروں کے بے برگ و بار ' ٹنڈ منڈ ٹہنیاں پھیلائے کھڑے باغ کے
ایک کنج میں تیری آنسو بھری مایوس آنکھیں اور "بداہ" کہنے کے لئے آخری بار اٹھتا
ہوا ہاتھ ہو گا۔انت میرے کتنا قریب آگیا ہے اور صرف تیس سال پرانی بات کتنی
دور ہو گئی ہے موت تو ایک لمبی نیند ہے ابد تک کے لئے اور اس کے مقابلے میں
تیس سال کی مدت تو کوئی بات ہی نہیں ' کوئی وقفہ ہی نہیں ' وقت کے لامتناہی سمندر
کے سامنے محض ایک قطرہ ' اے وقت ! تو ذرا تھم میں ان زور زور سے پر مارتے
ہوئے کالے کالے پرندوں کی طرح ابھی اڑ کر جاتا ہوں اور تیس سال پہلے کے زمانے
میں پہنچتا ہوں۔وہاں سردی میں ٹھٹھری ٹہنیوں کی بجائے انار کے بوٹے ہری ہری
پتیوں سے لدے ہوں گے اور ان میں جا بجا دہکتے ہوئے سرخ انگاروں جیسی کلیاں نکی
ہوں گی سردی کا موسم بیت چکا ' اب تو گرمی کا موسم ہے نا۔تیری آنکھوں میں آنسو
نہیں مسکراہٹیں چھلک رہی ہوں گی۔تیرے انار کی کلیوں جیسے نازک سرخ لب شدت
جذبات سے تھر تھرا رہے ہوں گے۔افسردہ و پژمردہ چہرہ خوشی سے تمتما رہا ہو گا۔
الوداع کہنے کے لئے اٹھنے والی لمبی بانہہ میری گردن سے لپٹ رہی ہو گی۔سامنے کھڑکی
میں لوہے کی سلاخیں عمودی گڑی ہیں اور اس کے بعد جالی ہے خدا معلوم میں تجھے یاد
بھی ہوں یا نہیں۔اگر یاد بھی ہوں تو وہ جذبات بھی ہیں کہ نہیں۔اگر وہ جذبات بھی
ہیں تو ان کے اظہار کی جرات بھی ہے کہ نہیں اگر ان کے اظہار کی جرات ہے تو کیا
تو بھی ہے کہ نہیں۔آج شام کتنی اداس ہے ؟ تپتے بیابان میں تنہا کیکر پہ بولتی فاختہ کی
آواز کی طرح سنسان اور پرہول۔نیچے سڑک پر بچوں کا غول شہتوت کے درخت پہ

بسیرا کرنے والی چڑیوں کی طرح شور مچا رہا ہے اور آج بھی بچے وہی پرانا کھیل اسی جوش و خروش سے کھیل رہے ہیں۔جس طرح اس شام کھیل رہے تھے۔

لک چھپ جانا

مکئی دا دانہ

راجے دی بیٹی آئی جے

تو نے گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھ کر جھنجلائی ہوئی آواز میں پکارا تھا " نرملا ' مدن جلدی گھر آو ' بہت رات ہو گئی۔ماتا جی بلاتی ہیں " ادھر سے پھر ہانک بلند ہوئی

لک چھپ جانا

اور سب بچے نرملا ' مدن سمیت پھر اندھیرے کونوں کھدروں میں غائب ہو گئے۔تو تنگ آکر انھیں پکڑ کر لے جانے کے لئے نکلی اور اس طرح ایک راجہ کی بیٹی اپنے مجرموں کو تلاش کرتی کرتی بڑ کے بوڑھے چھتنار درخت کے نیچے ' اپنے پیتم کی ترسی ہوئی بانہوں میں آگری ہم دونوں کے دل کیسے زور زور سے دھڑک رہے تھے ؟ ہمارے بدن لرز رہے تھے کہ ہونٹوں سے کوئی بات نہ نکل سکتی تھی۔تیرے سانسوں کی مہک میرے رگ و پے میں جذب ہو رہی تھی جیسے سوکھی ریت میں پانی۔وہ کیا جذبہ تھا جس نے ملنے کے چند ثانیوں کے اندر ہمیں اس طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا کہ ہم اپنے بدنوں کی ڈھیتی دیواروں کو سہارا دینے کے لئے بڑ کے تنے سے ٹیک لگانے پر مجبور ہو گئے۔کوئی پرندہ پتوں میں پر پھڑپھڑاتا ہوا اڑا۔ہم اس جانکاہ مگر میٹھے خواب سے چونک گئے۔تو ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی جا رہی تھی ' واپس اپنے مجرموں کی تلاش میں۔اور میں بھیگتی مسوں کے لڑکے سے ایک دم جوان رعنا بن گیا۔پر اعتماد شاید اپنے آپ پر قدرے مغرور بھی ' ہم نے کتنی ہی راتیں بوڑھے بڑ کے پروں کے نیچے اس کے پاؤں میں بیٹھ کر گزار دیں۔چاہے آکاش سے نیلی نیلی چاندنی برستی اور چاہے اندھی بھیانک رات ہوتی وہ ہمیں اپنے پروں میں سمیٹ کر دنیا کی آنکھوں سے اوجھل کر دیتا۔وہ ہم پہ کتنا مہربان تھا جیسے ہم اس کے دو لاڈلے بچے ہوں۔وہ ہمیشہ چپ سادھے رکھنے والا بوڑھا بڑ ' یاد ہے ! ایک رات کی گہری خاموشی میں ہم سے بولا تھا ' ہلکے ہلکے اپنی گہری گمبھیر آواز میں ' ایک رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ایک دھیرج کے ساتھ۔

"میرے بچو! سمے کب کسی کے لئے رکا ہے جو تمہارے لئے رکے گا۔ایک ننھی ہری بیل کی طرح کی میٹھی کسک کہیں من سے لپٹی رہ جائے تو بہت ہے جو اداسی کی ہوا کے سامنے کبھی کبھی اپنی نرم نازک پتیاں دل کی پتھر جیسی سخت دیواروں پر پھڑ پھڑا دیا کرے"۔

یہ کون بولا ؟ کتنی مہان آواز تھی کہ لمحہ بھر کے لئے پوری کائنات ' جب سے بنی ہے اور جب تک رہے گی اس کے ایک ایک ذرے کا ہر ہر دکھ بلور کے چمکتے ہوئے ٹکڑوں کی طرح بکھر کے ہمارے سامنے تھا۔ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماضی ' حال اور مستقبل تو ایک مکمل مربوط ' ناقابل تقسیم اکائی ہے کتنی سندر آواز تھی کہ ہمارے جسم اس کی سندرتا کی ٹھنڈی حدت کے سامنے پور پور ' ریشہ ریشہ ' رواں رواں پگھل کے وقت کے اتھاہ ' امر ساگر میں مل گئے۔ہم نے یہ تجربہ اپنے حواس اور احساس کی پوری شمولیت کے ساتھ کیا۔ہم اتنے چھوٹے اور کم حیثیت کہ ریت کے ذرے سے بھی کمتر اور تجربہ جس سے ناگہانی دو چار ہوئے اتنا بڑا کہ بھگوان سے بات کرنے کے سمان۔ہماری زبانیں گنگ ' چہرے فق اور دل خوف و حیرانی سے بھرے ہوئے تھے۔ذرا سنبھلے تو بڑ کے پاؤں پکڑ لئے "بابا! ہم سے اور باتیں کرو ' نا"

اس کا گھنا وسیع چھتر اپنے مضبوط تنے پر جما ' ہوا کے جھکوروں کے ساتھ دھیرے دھیرے ' سب سے بے نیاز ' جذب و کیف و مستی کے عالم میں رقص کرتا رہا۔ہماری منت و زاری کے باوجود اس نے ہونٹ نہ کھولے بلکہ پھر کبھی نہ کھولے۔وہ تو مہاراج بکرماجیت تھا جو اپنی بجنی سے بچھڑنے کے دکھ میں اپنے شاہانہ جاہ و حشم اور اپنی غیر معمولی فہم و فراست اور اپنے بے اندازہ مال و منال سمیت بڑ کا روپ دھار کے کھڑا ہو گیا تھا۔وہ تو بدھ تھا جو اپنے دکھ سہنے والے شریر اور مہا آتما کو سنبھالے اپنے ہی گیان کے پرسکون دھیان کے لئے بڑ بن گیا تھا۔

میرے سامنے کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں عمودی گڑی ہیں اور اس کے بعد جالی ہے۔آج شام بہت اداس ہے مگر آج شام ننھی ہری بیل کی نرم پتیوں نے میرے دل کی پتھر جیسی سخت دیواروں سے پھڑ پھڑا کے جو دستک دی ہے وہ میں نے سن لی ہے اب دفعتاً" مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ میں ان تیس سالوں میں کتنا دکھی رہا ہوں ' شاید تجھ سے بچھڑ کے اتنا نہیں جتنا تجھے ' اپنی ملاقاتوں اور صدیوں پرانے ' بوڑھے اور

مہربان بابا کو بھول کے دکھی رہا ہوں میں کتنا مورکھ تھا کہ دکھ بڑھتا تھا تو دل کی سخت دیواروں کو اور سخت کر لیتا اس سے دکھ اور بڑھتا تھا۔ یہ ایک لایعنی دوڑ تھی جو اس لمحے تک چلتی رہی ہے۔ کیا تیرے دل کے اردگرد میٹھی کسک کی ننھی ہری بیل لپٹی تھی؟ اگر لپٹی تھی تو کیا اس کی نرم پتیوں کی دستک تو نے کبھی اپنے دل کی دیواروں پر سنی ہے؟ جب تو دلہن بن کے گھر سے رخصت ہوئی تھی تو دور سے بڑ کے درخت نے اپنی مہان اور سندر آواز میں تجھے کچھ کہا تھا ؟ تو جانے سے پہلے اس کے پاؤں چھو کے آئی تھی ! تو نے اس کے بڑے تنے سے کان لگا کے ہمارے دلوں کی دھڑکنیں سنی تھیں جو ہماری ملاقاتوں کے درمیان ایک ایک کر کے اس میں جذب ہوتی رہی تھیں۔ تجھے وہ باتیں اس نے دہرائیں جو پہروں ہم اس کے نیچے بیٹھ کر کیا کرتے تھے ؟ وہ دبی دبی ہنسی سنائی دی ؟ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کے غم سے اٹھتی ہوئی سسکیوں اور آہوں کی بازگشت نے تڑپایا ' نہیں ' کچھ بھی نہیں ہوا ہو گا۔ اول تو تم وہاں گئی نہیں ہو گی اور اگر گئی بھی ہو گی تو اس نے وہ خزانہ تم اکیلی کے سامنے دھرنے سے انکار کر دیا ہو گا۔ ٹھہرو ! میں آرہا ہوں ' ابھی ان زور زور سے پر مارتے ہوئے کالے پرندوں کی طرح اڑتا ہوا۔ پھر ہم دونوں مل کر بابا کے تنے سے کان لگائیں گے تو وہ ہماری ہر دھڑکن اور ہر آواز اسی ترتیب سے دہرانے پر راضی ہو جائے گا۔ میرے سامنے کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں عمودی گڑی ہیں اور اس کے بعد جالی ہے۔

تمہارا دولہا تمہاری طرح خوبصورت تھا ؟ تمہیں پسند آیا ؟ کاش میں اسے دیکھ سکتا۔ تو اسے پسند آئی ؟ ضرور آئی ہو گی۔ ایسی دلہن تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔ مگر کیا خبر تو نے شادی کی بھی یا نہیں ؟ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تمہاری شادی ہو بھی سکی یا نہیں ؟ آخری دنوں میں تو ہماری محبت کے چرچے پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ کیا کیا تہمتیں نہ لگیں کس کس طرح بات کا بتنگڑ اور پر کا کوّا نہ بنایا گیا حالانکہ قصہ محض اتنا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے مل کر جو تکمیل کا احساس ہوتا تھا وہ ہمیں بار بار ملنے پر مجبور کرتا تھا اور بس ہماری بدقسمتی یہ ہوئی کہ ایک ہندو لڑکی اور مسلمان لڑکے کا خاص طور پر تقسیم کے دنوں میں ' جب مذہبی فسادات زوروں پر تھے ' ایک دوسرے سے پریم کرنا اچرج اور اچنبھا بات تھی۔ چار دانگ میں بدنامی ہوئی۔ تیرے ماتا پتا ندامت کے سمندر میں غرق ہو گئے۔ تو اٹھتی ہوئی انگلیوں کے

خوف سے گھر سے باہر نہ نکل سکتی تھی اور طعنوں کے ڈر سے گھر کے اندر نہ رہ سکتی تھی۔ اتنی بدنام لڑکی کو کہاں کوئی بر مل سکا ہو گا۔ اور اگر ملا ہو گا تو بھونڈا بدصورت ہو گا جس کے لیئے تو دن رات نفرت کی آگ میں سلگتی رہتی ہو گی اگر کسی سلیقے کے آدمی نے لاعلمی میں تجھ سے بیاہ رچا لیا ہو گا تو بعد میں جب لوگوں سے تیرے متعلق رنگا رنگ کہانیاں سنی ہوں گی تو گھر سے نکال دیا ہو گا اور تو ایک بچہ چھاتی سے چمٹائے کلکتہ کے قحبہ خانہ میں بیٹھی اپنی دھول اڑتی آنکھوں سے ہر راہ گیر کو فحش اشارے کرتے ہوئے اپنی طرف بلا رہی ہو گی تا کہ اپنا اور بچے کا پیٹ پال سکے آخر ایک دن تو نے کسی سینی ٹوریم میں دم توڑ دیا ہو گا اور وہاں کے عملے نے تیری لا وارث لاش میڈیکل کالج کے ڈائی سیکشن ہال میں لا کر رکھ دی ہو گی جہاں طلبا تیرے بدن کے اعضا کی وساطت سے علم الابدان حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے کیونکہ بدن تو سبھی ایک سے ہوتے ہیں نا۔ انھیں کیا خبر ہو گی کہ یہ بدن کبھی کتنا نازک اور خوبصورت تھا۔ اس کے خطوط میں کتنی دل آویزی تھی، کہ سینکڑوں میل دور آج بھی کوئی اس بدصورت تھکے ہارے بدن کو اپنے دل کے کنول پر بٹھانے کے لئے تیار ہے۔ اس کے اندر کیسی معصوم اور پاکیزہ روح تھی جس نے ایک بار اپنے اندر بوڑھے دانا بابا کی مہان سندر آواز میں دیا ایدیش سمویا تھا۔ اس کی بدولت ننھی ہری بیل کی طرح کی میٹھی کسک اس کے دل سے لپٹی رہتی تھی اور جب اداسی کی ہوا چلتی تو بیل کی نرم نازک پتیاں اس کے دل کی دیواروں پہ جنھیں زمانے نے پتھر کی طرح سخت کر دیا تھا پھڑ پھڑاتیں تو یہ ان کی دستک بھی سن لیتی تھی۔ یہ بازار میں سر عام بکنے والا بدن کبھی اتنا حساس تھا کہ دیکھنے والی نظر اگر میلی ہوتی تو یہ چھوئی موئی کی طرح مرجھا جاتا تھا بڑے بڑے درختوں اور خاموش بنگلوں والی لمبی لارنس روڈ کے درمیان میں ایک کھوہی کے ارد گرد بارونق دو کانوں کا جھرمٹ ابھر آیا تھا۔ تو ایک گھر گھر کرتے تانگے میں اپنی ماتا جی کے ساتھ پیچھے بیٹھی اور چھوٹے بہن بھائیوں کو آگے بٹھائے ادھر جا رہی تھی میں اور اودھے پال سنگھ ایک ہی سائیکل پر سوار تانگے کے پاس سے گزرے تو تیرے ہونٹوں پر میرے لئے ایک خفیف سی مسکراہٹ (جیسی مونا لزا کے ہونٹوں پر ہے) لحظہ بھر کے لئے طلوع ہوئی اور ٹوٹ کر بکھر گئی اودے کو اس وقت معلوم نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ تجھے دیکھ کر وہ ایسا مچلا کہ

سائیکل تانگے سے آگے نکالنا اس کے لئے مشکل ہو گیا اور تیرے لئے اس کی نظروں کی تاب لانا مشکل تھا تو اپنے آپ میں سمٹ گئی اور گھبرا کے چہرہ موڑ کے سامنے دیکھنے لگی۔ تیری مصیبت کو جانچتے ہوئے میں نے اودے کو سمجھا بجھا کے سائیکل آگے نکالنے پر مجبور کیا۔

ہم کھوہی پر پہنچ کر رک گئے۔ پانی پینے کے لئے یا رونق دیکھنے کے لئے یا نادانستہ تیرا انتظار کرنے کے لئے۔ کھوہی کے تازہ ' ٹھنڈے یخ پانی کے گلاس ہم ہاتھوں میں پکڑے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تبرک جیسے احترام کے ساتھ پی رہے تھے یہ امیروں کی اس بستی کا عام ضرورت کی چیزیں خریدنے کا مرکز تھا۔ دلہنوں کی طرح سجی دوکانوں کے اندر دوکاندار سامان بیچنے میں مصروف تھے۔ دوکانوں کے سامنے بڑا سا خالی احاطہ تیز دودھیا روشنی میں دمک رہا تھا۔ بچے رنگین تتلیوں کی طرح اڑتے پھر رہے تھے غرور حسن سے بھری عورتیں ناچتے موروں کی سی تمکنت اور شان لئے ادھر سے ادھر آجا رہی تھیں۔ بھوک کے مارے فقیر مکھیوں کی طرح بھنبھناتے پھر رہے تھے۔ احاطے کے ایک کونے میں مینڈک کی طرح غلیظ ' پھولا پھولا ' زرد رنگ شخص اپنے ہی پسینے میں ڈوبا ' آلتی پالتی مارے مگن بیٹھا کڑکڑاتے گھی میں پوریاں تل رہا تھا پوریوں کی مہک سارے احاطے میں پھیلی مچل مچل کے نتھنوں میں گھس کے اشتہا کو ابھار رہی تھی۔ ان سب سے بے نیاز پنکج ملک اپنی دھن میں گا رہے تھے۔

دو نیناں متوارے تہارے

ہم پر ظلم کریں

ہجر کی آگ میں جلتے ہوئے کسی دیوتا کی سوز و درد میں ڈوبی بلند پکار پورے ماحول کو اپنے قبضے میں لئے بار بار دو متوارے نیناں کے ظلم کی کتھا دہراتے ہوئے بے بس دلوں کو انجانے حزن کے سمندر کی اتھاہ خاموشیوں میں کھینچے لئے جا رہی تھی۔ میں اور اودے حزن کے اس سمندر میں ڈوبے اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے اور چپ تھے کہ اگر بات کی تو جاگتی آنکھوں جو خواب دیکھ رہے ہیں ٹوٹ جائیں گے۔ تو شاید ان دو مختلف ذہنوں کے خوابوں میں موجود تھی مگر یقیناً الگ الگ انداز اور رنگ میں۔ ہم غالباً تیرے منتظر تھے۔ کیونکہ جب سڑک کے کنارے تیرا تانگہ آکر رکا تو ہم دونوں میں کسی کو کوئی تعجب نہیں ہوا تو نے قدم نیچے دھرا اور اودے نے ٹکٹکی باندھ دی ہر

دیکھنے والے کو تجھے دیکھ کر پتہ نہیں کیا کیا یاد آیا ہو گا کہ اک اک کی نظریں بہک گئیں تو بہکتی بھٹکتی نگاہوں سے بچنے کے لئے سمٹتی سمٹاتی آنکھیں نیچی کئے احاطے میں سے تیز قدموں سے پوریوں کی دوکان کی طرف بڑھتی ہوئی اب ' اس گھڑی میں بھی مجھے اسی طرح نظر آرہی ہو ننھے ننھے مدن اور نرملا تیرے پیچھے پیچھے دولیلوں کی طرح ممیاتے کد کڑے لگاتے جا رہے ہیں۔اودے کے قدم تیرے پیچھے اٹھنے لگے تو میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا " اودے سنو! مت جاؤ ' یہ لڑکی میری دوست ہے "

اس کے قدم تو رک گئے مگر آنکھیں ' جن میں ہزاروں سوال تیر آئے تھے ' میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

" یہ لڑکی! .... اور تیری دوست ' کیوں جھوٹ بول رہے ہو ؟ مجھ پر رعب ڈال رہے ہو؟ یہ لڑکی تو ہے ہی نہیں ' یہ تو دیوی ہے ' یہ کسی کی بھی دوست کیسے ہو سکتی ہے ؟ میں حسد میں جل رہا ہوں ۔ رقابت کا جذبہ مجھے مارے ڈال رہا ہے میں اسے تم سے چھین لوں گا میں اسے زبردستی اغوا کرلوں گا تو تو میرا جگری یار ہے۔ تجھے مل گئی تو مجھے کوئی گلہ نہیں مجھے تجھ پر فخر ہے"۔

تجھے دراصل اودے سے شادی کرلینی چاہیے تھی ' وہ ہم دونوں کو بہت چاہتا تھا اس لئے تیرا معصوم گناہ معاف کر دینا اس کے لئے ممکن ہوتا مگر ایک بات ہے ' تو اس کی دھرم پتنی بن کر شاید ایک اوسط درجے کی خوش زندگی تو گزار لیتی مگر وہ روحانی تجربے جو ہم دونوں مل کر کرتے اس کی معیت میں ان کا کوئی امکان نہ تھا وہ حد درجہ پریکٹیکل آدمی تھا۔ لیکن قدرت کے ایسے انعام کسی کا حق تو نہیں ہوتے یہ جب ملتے ہیں بنا مانگے ملتے ہیں۔کئی اس کے حضور صدیوں تک سیس نوائے کھڑے رہتے ہیں۔وہ منہ پھیر کے ایک نظر بھی نہیں ڈالتی اور جو وہ دیالو ہوتو ہم جیسے اناڑیوں اور کچوں پر اسے لاکر ڈھیر کر دے جو سوائے خوف سے تھرانے کے کچھ نہیں جانتے کہ کیا کریں۔اگر ہم عمر بھر بھی اکٹھے رہتے تو ممکن ہے پھر کبھی ویسا لمحہ لوٹ کر نہ آتا ہم بھی محض ایک عام سی زندگی گزارتے۔تو آج بھی ماتا جی کی طرح آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے ایک موٹی سی سفید رنگ کی ادھیڑ عمر عورت ہوتی جو دن بھر گھر کے کام کاج میں جتے رہنے کے بعد دیوار کا سہارا لئے کھڑکی میں کھڑی میرا اور سکول سے لوٹنے والے بچوں کا انتظار کرتی۔

شام کے ساتھ اداسی بھی ڈھل گئی ہے چمکتا ہوا چاند ' آدھ آسمان میں اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے کھڑا مسکرا رہا ہے ۔ایک ننھی ہری بیل کی طرح کی میٹھی کسک جو میرے من سے لپٹی ہوئی تھی اس کی نرم پتیاں میرے دل کی دیواروں پر پھڑ پھڑا رہی ہیں جو اب سخت نہیں رہی ہیں ہم تو مٹی کے پتلے ہیں ' فانی ہیں لیکن بڑ کے نیچے حاصل ہونے والا ایک اس لمحے کا گیان امر ہے ۔میرے سامنے کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں عمودی گڑی ہیں اور اس کے بعد جالی ہے لیکن اب مجھے ان سے باہر نکل کر زور زور سے پر مارتے ہوئے پرندوں کی طرح اڑ کر جانے کی ضرورت نہیں ہم کہیں بھی رہیں اور کیسے ہی حال میں ہوں ' وہ ایک لمحہ جو تیرے اور میرے پریم کا حاصل ہے امر گیان کی صورت میں میرے پاس بھی ہے اور تیرے پاس بھی ہو گا ۔

دریائے سوات

(ایک سفرنامہ)

ہم بحرین پہنچے تو شام کے سات بج رہے تھے۔ گہرا سانولا رنگ پکڑتی شام میں سیاہ چٹانیں اور اونچے ہی اونچے ہوتے سامنے اور دائیں بائیں کے تینوں پہاڑ ایک ہی رنگ اور ایک ہی طرح کی مدبرانہ سی افسردگی لئے ہوئے تھے۔ دریائے سوات غل مچائے جا رہا تھا مسلسل متواتر کبھی نہ تھمنے والا میں سڑک کے کنارے چٹانوں اور پہاڑوں کی سی افسردگی میں لپٹا سامان کی رکھوالی کے لئے کھڑا تھا اور میرا ساتھی سامنے جگمگ جگمگ کرتے چار منزلہ ہوٹل میں کمرہ لینے گیا تھا۔ کھوکھا نما دکانوں کی تیز روشنیوں میں ادھر ادھر تھکے ہوئے اداس چہروں اور شوخ قباؤں والی عورتیں گتے کے ڈبوں میں بغور کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اتنی دور آکر شاید کسی مسکراہٹ کے کھوج میں تھیں کہ اگر مول مل سکے تو چہروں پر سجالیں۔ خوشحالی اور گہری اداسی کو یوں بہم یک جا دیکھ کر آج بھی ایک بار میرا دل ڈوب سا گیا۔ ہاتھ میں چھابا پکڑے ' ننگے پاؤں دوڑتے آتے لڑکے نے سڑک کے وسط میں میرے برابر پہنچ کر ایک کراری آواز لگائی " چار روٹی ' آدھ سیر گوشت" دوکاندار نے آگ تیز کرنے کے لئے پنکھا جھلاتے ہوئے وہیں سے بیٹھے بیٹھے پشتو میں ایک بوچھاڑ ماری جس میں میری سمجھ میں صرف " ہخ پلے " آیا۔ میں نے زیر لب دہرایا۔ ہخ پلے اور مسکرا دیا۔ مجھے نہ صرف اس لفظ

کا ترنم پسند آیا بلکہ اس کی آواز محبوب کی پھبتی اڑاتی ہوئی پیار کی بات کے معنی دیتی ہوئی سی معلوم ہوئی۔ یوں سمجھئے جیسے آپ حیا سے مٹی جاتی کسی حسینہ سے کہیں کہ جی چاہتا ہے تمہارے شرم سے سرخ ہوتے اس چہرے کے ہنچ پلے کرلوں یا میں تم پر ہنچ پلے ہو جاؤں یا آؤ زندگی میں دونوں مل کر ہنچ پلے کریں یا اسی طرح کی کوئی اور بات۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے معنی ہیں ازخود۔ خدا معلوم دوکاندار کس ضمن میں استعمال کر رہا تھا۔ لڑکا پلٹا اور اسی رفتار سے دوڑتا ہوا ایک گلی میں گھوم گیا۔

ویسے ہی اداس چہروں والی عورتوں سے ٹھسا ٹھس بھری چند کاریں جو غالباً تپتے میدانوں سے بھاگم بھاگ آ رہی تھیں۔ تیزی سے میرے پاس سے گزر کر چار منزلہ ہوٹل کے صحن میں پہنچیں اور رنگا رنگ کاروں کے جھنڈ میں کھڑی ہو گئیں۔ پھٹے کپڑوں اور زرد چہروں والے مریل سے قلی سلواریں اڑستے ہوئے ان کی طرف لپک رہے تھے۔ ایک ایک دو دو بلا مقصد ٹہلتے ہوئے صم" بکم" آدمی گردن اوپر کر کے زمین پر پھیلی کالی سیاہ شام کے مقابلہ میں پہاڑوں کی سنو لائی چوٹیوں کو بغور گھورتے تھوک نگلتے میرے پاس سے گزر رہے تھے' کچھ چڑھائی چڑھ کر کہیں گم ہو جاتے کچھ ڈھلوان اتر کر اندھیرے میں غائب ہو جاتے۔ ان میں سے کچھ پھر لوٹ آتے۔ باقی شاید شور مچاتے دریا کی نذر ہو جاتے۔ آنے والے پھر اسی طرح اس گھٹی ہوئی وادی کی تنگنائے میں چھاتی پر چڑھے آتے پہاڑوں کی چوٹیوں کو بغور گھورنا شروع کر دیتے وہاں وہ کیا دیکھ رہے تھے؟ چیڑ کے درختوں کو؟ وہاں اب چیڑ کے درخت کہاں تھے! کچھ ہیولے سے باقی رہ گئے تھے اور پھر اگر وہ ہیولے ہی دیکھنا تھے تو اس کے لئے چہروں پر اس قدر سنسنی پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ شاید ڈرتے تھے کہ آسمان سے لگی ان چوٹیوں پر آسمان سے پھسل کر کوئی آفت آگرے گی جو آن کی آن میں ان کی روحوں کو ننگا کر کے انہی کے سامنے کھڑا کر دے گی اور کہے گی آؤ انہیں دیکھو تب وہ انہیں کیسے دیکھ سکیں گے یا شاید وہ متوقع تھے اور صرف متوقع تھے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے اور کیا خبر اب کے خلاف معمول کچھ اچھا ہی ہو۔ شاید خدا اپنے سنگھاسن سے اتر کر اپنے پھول جیسے سبک پاؤں ان سنگلاخ چوٹیوں پر دھرتا ہوا ان کے سامنے کھڑا ہو جائے اور ان کی روحوں کے اندر دھڑ دھڑ جلتی چتائیں اسی لمحے بالکل شانت اور شبنم کی طرح ٹھنڈی ہو جائیں اور وہ کہے میرے بلکتے ہوئے بچو چلو! میرے

پاس سورگ چلو تمہارے ساتھ بہت ہو چکی

دریائے سوات شور مچائے جا رہا تھا۔ متواتر، مسلسل، کبھی نہ تھمنے والا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں دوڑ کر جاؤں اور ہوٹل اور بازار کی اوٹ میں چھپے اس شور مچانے والے کو قریب سے ایک نظر دیکھ تو آؤں مگر سامان چوری ہو جانے کا خوف تھا

تین لڑکے چشمے سے پانی کے آٹھ دس کنستر بھر کر انہیں ریڑھی پر رکھے۔ ایک دوسرے کو حوصلہ دلاتے، زور لگاتے آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے اوپر لا رہے تھے، سامنے ڈھلوان سے ویسے ہی تین لڑکے خالی ریڑھی تیزی سے دوڑاتے لا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ریڑھی دانستہ اس ریڑھی میں دے ماری۔ ایک کنستر اچھل کر نیچے آ رہا۔ کالی چادروں میں سر سے پاؤں تک لپٹی چلی جاتی بی بیاں بدکیں، کنستر سے بہتے پانی سے ان کے پائنچے اور چادروں کے پلو بھیگ گئے اور چہرے قدرے کھل گئے۔ خشک سوکھی ہوئی ٹانگیں، سرسوں کے مرجھاتے ہوئے پھول جیسے زرد چہرے۔ سامنے دوکان کے دروازے کے ساتھ لٹکائی ہوئی کڑاہی گوشت کی خالی کڑاہی کی طرح کالی، خالی آنکھیں ایک لحظے کے لئے دکھائی دے کر گم ہو گئیں۔ یہ چہرے بھی اداس تھے۔ خالی ریڑھی والے تینوں لڑکے قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک راہرو سفید ریش بزرگ نے آگے بڑھ کر ان کو ڈانٹا، واقعی ایسے اداس ماحول میں ہنسنے کی کہاں گنجائش تھی۔ شور آ رہا تھا متواتر مسلسل کبھی نہ تھمنے والا۔

ایک جانی پہچانی آواز دور سے میرے کان میں پڑی۔ گھوم کر دیکھا تو جس اسٹیشن ویگن میں ہم آئے تھے اس کا کلینر کوئی تیس گز دور سڑک کی ڈھلوان پر کھڑا "آنے دو، آنے دو" کی آوازیں لگا کر ایک مناسب کونے میں ویگن کو رات کے لئے پارک کرا رہا تھا۔ اس کی آواز میرے ذہن میں نقش تھی۔ منگورہ سے بحرین تک کوئی پینتیس میل کی مسافت ہم نے تقریباً ڈھائی گھنٹے میں طے کی اس دوران میں نے اسے ہزاروں مرتبہ سواری اتارتے اور چڑھاتے وقت "زازی، چلو چلو" کا نعرہ لگاتے سنا تھا

ڈرائیور اور کلینر دونوں ڈینڈی قسم کے نوجوان تھے۔ ہر اترنے چڑھنے والی زنانی سواری کے بدن کو پردے کے اندر ہی اندر نظروں سے خوب اچھی طرح ٹٹول لیتے۔ پیچ در پیچ پہاڑی سڑک پر جب ویگن پوری رفتار سے بھی دوڑ رہی ہوتی تو ڈرائیور منہ پیچھے پھیر کر کلینر کو بلند آواز میں پشتو میں لمبے لمبے سوال کرتا اور اتنے ہی لمبے

جواب اس سے بھی بلند آواز میں سنتا۔ وقفہ وقفہ سے خوب کھل کر ہنسنے کی نوبت بھی آتی رہتی۔ دونوں اپنے اقتدار و اختیار کے نشے میں جی بھر کے چور تھے۔

راستے بھر وہ سواریوں کے اوپر سواریاں بٹھاتے آئے لیکن کسی کو اعتراض و احتجاج کا حوصلہ نہ تھا۔ سواریاں ٹرک میں لدی ان بھیڑوں کی طرح بالکل خاموش اور اپنے اپنے دست و پا سے بے خبر تھیں جنہیں ٹرک سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے لئے بیوپاری پوری طرح ٹرک بھرنے کے بعد ٹرک کے بالائی حصہ کی پوری لمبائی چوڑائی پر چار پائیاں ڈال کر رسیوں کے جال میں ایک ایک بھیڑ کی ٹانگیں پھنسا پھنسا کر ان چار پائیوں کو بھیڑوں سے بھر دیتے ہیں۔ الٹے ' سیدھے ' آڑے ترچھے ' مظلوم مغموم چہرے اور ان پہ ہوا میں ٹکٹکی باندھے کچھ بھی نہ دیکھتی ہوئی بھوری بھوری آنکھیں اور نیچے سفید سفید بلاوجہ لٹکتی ہوئی بے حرکت چھوٹی چھوٹی ٹانگوں جیسی چیزوں کی ایک پھپھوندی سی پھیلی ہوتی ہے۔ وہ اسی اذیت ناک حالت میں سینکڑوں میل کی مسافت طے کرتے ہوئے اپنے مقتل کی طرف چپ چاپ رواں رہتی ہیں۔ یہ مظلوم چپ کیوں سادھ لیتا ہے؟ اس لئے کہ جب تک وہ بولتا رہے مظلوم نہیں ہوتا۔ ظالم پر تو لوگ ایسے ہی الزام دھر دیتے ہیں۔ مظلوم پر ظلم تو اس کی اپنی چپ ہی ڈھاتی ہے بعض اوقات اگر وہ چپ نہ ہو تو اسے خود بھی چپ کرانا پڑتا ہے

جب ویگن کے اندر اور چھت پر تل دھرنے کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تو راستے میں ڈرائیور کا ایک دوست مل گیا۔ اس نے کمال فراخ دلی سے اپنا دروازہ کھول کر اسے داہنے ہاتھ اپنی سیٹ پر بٹھا لیا کیونکہ بائیں طرف تو پہلے ہی تہ در تہ سواریاں دھری تھیں۔ بقیہ راستہ یہ دوست صاحب سگریٹ سلگا سلگا کر اپنی ہی مٹھی سے ڈرائیور کو چونگاتے آئے۔ سارڈین کے ڈبے کی طرح بھری ہوئی اس ویگن سے باہر کا منظر کبھی کبھی بجلی کے ایک کوندے کی طرح نظر آ کر گم ہو جاتا۔ زیتون کے کالے کالے ' خاردار جھاڑیوں کی صورت والے درختوں کے جھنڈ (جن پہ نظر پڑتے ہی نہ جانے کیوں فلسطین اور سپین یاد آ جاتے) سیب کے باغات ' بلند و بالا انجانے ناموں والے معتبر درخت ' سڑک کے ساتھ ساتھ کبھی دور کبھی نزدیک بہتا ہوا دریا اور اس کے کناروں پر چاول اور مکئی کے لہلہاتے کھیت ' پر وقار سبز پہاڑوں کی دھواں اڑاتی

ہوئی چوٹیاں ' پہاڑ کے پہلو سے زخم کی طرح رس رس کر بہتے ہوئے جھرنے ' زمین سے ابلتے ہوئے چشمے جن کا پانی دریا کی طرف منہ کئے اڑتا چلا جا رہا تھا۔ مگر یہ سب ہمارے آزار سے اس طرح لا تعلق تھے جیسے ڈرائیور اور کلینز بیشتر وقت مجھے صرف سامنے شیشے سے ذرا اوپر چھت پر لکھا یہ "شعر" ہی نظر آتا رہا:

جوانی میں عدم کا کچھ نہ کچھ سامان کر غافل
مسافر شب کو اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے

اور وہ دونوں اپنی جوانیوں میں ' ہمارے لئے عدم کا سامان کرنے میں بڑی شد و مد سے مصروف نظر آ رہے تھے۔

میرا ساتھی واپس آیا تو منہ لٹکا کر کہنے لگا "یہاں کوئی کمرہ نہیں۔ دو تین ہوٹلوں میں دیکھ کر آیا ہوں کسی میں کوئی کمرہ نہیں۔ لوگ بکنگ کرا کے چلتے ہیں۔ یوں تھوڑا ہی منہ اٹھا کر چل پڑتے ہیں ہماری طرح"۔ اس کے ساتھ ننگے پاؤں ایک لڑکا چمٹا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا "پیچھے ذرا فاصلے پر ایک ہوٹل ہے۔ وہاں دیکھ لیں شاید کمرہ ہو"۔ وہ ادھر چلے گئے۔ دریا مسلسل ' نہ تھمنے والا شور بلا توقف اسی رفتار سے کانوں میں انڈیلے جا رہا تھا۔ میں وہاں سامان کے پاس کھڑا پھر ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے خول میں چلا گیا۔

"کمرہ مل گیا" لڑکے نے میرے قریب آ کر فاتحانہ انداز میں نعرہ لگایا ' سامان اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور چل پڑا۔ جانی نے کہا "پانی کا کتنا شور ہے"۔

ہم دڑبے میں سامان رکھ کر فوراً واپس آ گئے۔ دریا پاگلوں کی طرح پتھروں اور چٹانوں سے ٹکریں مارتا اپنے کناروں سے نکل کر کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ہم کنارے سے پلٹ کر سڑک پر آئے۔ چند قدم چلے تو دریاول ندی کے پل پر تھے جو کودتی پھاندتی پل کے نیچے سے گزرتی دریائے سوات میں مل رہی تھی۔ پل سے ذرا آگے ' دریا کے کنارے کنارے کالام تک جاتی اس سڑک پر زمین سے کوئی چار فٹ اونچا لوہے کا پائپ آڑا دھرا تھا۔ جس کے درمیان میں بورڈ لٹک رہا تھا اور اس پر انگریزی کے سرخ حروف میں لفظ سٹاپ درج تھا۔ ہم اس کے نیچے سے گزر کر بہت دور تک نکل گئے۔ ایک مکمل ویرانہ ' تنگ وادی پر ستاروں جڑا ایک تنگ آسمان ' ستاروں تک اوپر ہی اوپر اٹھتے ہوئے سیاہ ہیولوں کے سے دورویہ خاموش پہاڑ تھے۔

دیوتاؤں کی طرح بے نیاز پہاڑوں کے پاؤں بیچ ' تڑپتا ' پھڑکتا ' پیچ و تاب کھاتا ' زور زور سے شور مچاتا کوئی پچاس ساٹھ فٹ چوڑا دریا دوڑا جا رہا تھا۔ یہ وادی کب سے یوں کھڑی ہے؟ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے اور دریا اپنے پانی کے گزران سے اس کے لحظے لحظے کا حساب رکھتا ہے۔ یہاں یہ دریا اپنے لڑکپن میں ہے۔ کھلنڈرا اور لاپرواہ ' منگورہ تک پہنچتے پہنچتے یہ اپنی ادھیڑ عمر کو پہنچ جاتا ہے۔

وہاں کھلی وادی میں اس نے اپنے دونوں کناروں پر دور دور تک چاول اور مکئی کے کھیت پھیلا لئے ہیں۔ اس کی پیدائش ' اشرو اور تروٹ کے جھرنوں اور برفانی تودوں سے ہوتی ہے اور پھر یہ دریائے کابل میں اپنے آپ کو ملا کر مٹ جاتا ہے۔ دریا ہر لحظہ پیدا بھی ہو رہا ہے ' جوان بھی ہو رہا ہے اور مر بھی رہا ہے۔ جانداروں کی طرح اس کی عمر مختلف خانوں میں بٹی ہوئی نہیں بلکہ خود وقت کی طرح ایک مسلسل اور پیہم عمل ہے کبھی نہ رکنے والا کبھی نہ تھمنے والا ' کبھی نہ ختم ہونے والا ہر لحظہ ابتدا ہے ہر لحظہ انتہا۔ جب یہ رک جائے گا تو وقت رک جائے گا اور جب وقت رک جائے گا تو قیامت آ جائے گی۔ پہاڑ ' سمندر ' زمین ' آسمان کارڈوں کے گھروندوں کی طرح سب دھڑام سے گر جائیں گے۔

جب ہم تھکے قدموں سے چلتے واپس آئے تو بازار بند ہو چکا تھا اور چکا چوند روشنیاں غائب تھیں۔ کہیں کسی ہوٹل یا دوکان کے بند دروازے پر بتی جل رہی تھی جو محض جل رہی تھی اور کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔ صرف دریاول ندی ابھی تک اسی طرح کودتی پھاندتی دریائے سوات میں گر رہی تھی۔ کئی منزلہ ہوٹل کی کھڑکیاں اب اندھی ہو چکی تھیں۔ شوخ قباؤں میں پھنسے ہوئے بدن اب پلنگوں پر پھیل گئے ہوں گے۔ احاطے میں کھڑی کاریں سحر زدہ جانوروں کا غول معلوم ہوتی تھیں۔ تکے والے کی دوکان کے آگے دو کتے نہایت مفاہمت سے بیٹھے ہڈیاں چچوڑ رہے تھے۔ ایک بلی دور سے انہیں گھات لگائے تاک رہی تھی۔ ہاتھ میں چھابا پکڑ کر ننگے پاؤں دوڑنے والا لڑکا بھی سو گیا ہو گا۔ گردن اونچی کر کے سانولی چوٹیوں کو بغور گھورنے والے صم " بکم " آدمی بھی اپنی اداسیوں کو سینوں میں چھپا کر سو گئے ہوں گے۔ کالی چادروں میں زرد چہرے اور میلی سلواروں میں سوکھی ٹانگیں بھی سو گئی ہوں گی ' بڑے بڑے مکوڑوں جیسی بے ہنگم دو ریڑھیاں لوہے کی زنجیروں سے زمین میں گڑی ایک میخ

سے بندھی تھیں ۔ وہ چھیوں لڑکے بھی سو رہے ہوں گے ' تین قہقہے لگانے والے اور تین بسورنے والے ۔ وہ ڈانٹنے والی داڑھی بھی سو رہی ہو گی ۔ یوں لگتا ہے کہ اب یہ سب سوتے ہی رہ جائیں گے اور کبھی نہیں اٹھیں گے کل ان کی جگہ نئے لوگ ہوں گے خدمت کرنے والے اور کرانے والے ۔ اداس پھرنے والے اور مسکراہٹیں ڈھونڈنے والے ہنسنے والے اور بسورنے والے ایسے ایسے یہاں پتہ نہیں کتنے آئے اور چلے گئے ۔ بس شور مچاتا دریا چلتا رہتا ہے زمین میں گڑے پہاڑوں کے چرنوں میں اور وہ آسمان کو گھورتے چلے جاتے ہیں اور کبھی کچھ نہیں بتاتے کہ اتنی بہت سی صدیوں کے گھورنے سے انہوں نے آخر کیا پایا ۔ کیا وہ بھی ٹرک میں لدی بھیڑوں کی طرح بلاوجہ ہوا میں گھورتے ہوئے کہیں جا رہے ہیں ---- صدیوں کا فاصلہ طے کر کے قتل ہونے کے لئے ۔

جانی نے کہا " یار ! اس سے کہو بہت رات ہو گئی اب پاگلوں کی طرح دوڑنا اور شور مچانا بند کر دے ۔ صبح ہو گی تو پھر دیکھا جائے گا" ۔

ہم مسکرا دیئے اور اسی طرح پھولتی سانسوں سے آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے دڑبے میں پہنچ گئے ۔ دروازہ بند کیا تو شور کم ہو گیا مگر دور سے شاں شاں کی آواز مسلسل آ رہی تھی ۔ دریا چل رہا تھا ۔ ہم روشنی بند کر کے پلنگوں پر دراز ہو گئے ۔ پتہ نہیں میری آنکھ لگی یا نہیں ۔ مجھے ایک جھٹکے سے احساس ہوا کہ شاں شاں کی آواز بند ہو گئی ۔ میں اچھل کر اٹھا ۔ بتی جلائی ' گھڑی ایک بج کر دو منٹ پر رکی کھڑی تھی سیکنڈ کی سوئی سکتے میں تھی ۔ وقت بند ' دریا بند ' " جانی اٹھ جاؤ قیامت آ گئی ہے ۔ دریا رک گیا ہے ۔ وقت رک گیا ہے" ۔ دروازہ کھولا ' شور کمرے میں امڈ آیا ' سیکنڈ کی سوئی پھر گردش میں تھی ۔ اطمینان کا سانس لیا ۔ ہم تیزی سے دریا کے کنارے پہنچے کہ کم از کم آج رات تو کسی طرح دریا کو چلنے پر آمادہ رکھیں کیونکہ اس ساری سوئی ہوئی وادی میں صرف ہم دو ہی تو جاگ رہے تھے ۔

اندھیرے میں دور تک ایک سفید پیچ و تاب کھاتی لکیر بچھتی ہوئی چلی گئی تھی ۔ ہم خوش تھے کہ شور اٹھ رہا تھا ۔ متواتر ' مسلسل ' کبھی نہ تھمنے والا ' دریا چل رہا تھا ۔ وقت زندہ تھا ۔ زندگی میں تو ہم وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے ہیں ۔ موت کے بعد شاید دھارے کے الٹے رخ بھی بہہ سکتے ہوں گے ' بالکل اسی انداز میں

جیسے آئینے میں ہر چیز الٹی ہو جاتی ہے۔ یا دھارے سے بھی تیز آگے کے رخ جا سکتے ہوں۔ مگر رخ کسی طرح بھی ہوں سیدھے ' الٹے ' آڑھے ' ترچھے ' ٹرک پر رسیوں کے جال میں پھنسی بھیڑوں کی طرح پابند کرنے والے ہیں ' قیدی بنانے والے ہیں ' گھٹن دینے والے ہیں ' آزار پہنچانے والے ہیں اور ہر ہر رخ وقت کا غلام ہے۔ جب تک وقت زندہ ہے ہم ہی کیا پوری کائنات اسی طرح پابند سلاسل رہے گی۔ یہ حلقہ در حلقہ زنجیر ہمارے خدا نے پوری کائنات کے گرد کس کے لپیٹ دی ہے اور جب بھی یہ ٹوٹے گی تبھی ذرہ ذرہ بکھر کے آزاد ہو سکے گا۔ کوئی خدا تو ہو گا جو اس کو توڑنے کی فکر میں ہو گا تاکہ دم گھٹتی ہوئی سواریوں کو منظر صرف بجلی کے کوندے کی طرح نظر نہ آئے وہ ویگن سے باہر نکل کر آزادی کا سانس لے سکیں اور خوبصورت منظر کو دیکھ سکیں ' اس کو اپنے اندر جذب کر سکیں اور خود اس میں جذب ہو سکیں۔ جب کوئی پکارے کہ آؤ اپنی ننگی روحوں کو دیکھو تو بلا عار دیکھ سکیں اور ان کا ننگ دور ہو چکا ہو۔ کنارے پر واقع ایک مکان پر دریا کے رخ والا بلب روشن ہو گیا۔ دور تک دکھائی دینے والی سفید پیچ و تاب کھاتی لکیر یکدم فنا ہو گئی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ صرف ہمارے سامنے دس پندرہ گز کی لمبائی میں دریا روشن تھا۔ چیختی چلاتی ' اپنی ہی شکتی کے زور میں بل کھاتی ' بپھری ہوئی موجیں ازلی اندھیروں سے دفعتاً" برآمد ہوتیں اور ایک ثانیے سے بھی کمتر وقفے میں رکنے کا بہانہ کرتی ہوئی ایک تیزی سے گھومتا گہرا بھنور بناتیں اور ابدی اندھیرے میں گر کر ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتیں۔ جیتے ' جاگتے دریا کو یوں روتے ہوئے ' پکارتے ہوئے نیستی کے اتھاہ غار میں زندہ دفن ہوتے ہوئے دیکھ کر ہم مبہوت رہ گئے۔ اس کائنات سے باہر کہیں وقت کا دھارا بھی یوں ہی نیستی کے اتھاہ غار میں خاموشی سے گر کر ہمیشہ کے لئے گم ہو رہا ہو گا۔ وقت کا دھارا چیختا چلاتا تو نہیں ہو گا۔ وہ تو اپنی عادت کے مطابق قطعی خاموش رہتا ہو گا۔ مگر کون جانے معدوم ہونے سے پہلے ہلکی ہلکی سسکیاں لیتا ہو۔ اس سوئی ہوئی پوری وادی میں صرف دو جاگنے والے جو اپنی دانست میں کسی نہ کسی طور اندھیری رات میں دریا کو چلتے رہنے پر آمادہ رکھنے کی ذمہ داری اٹھائے وہاں آئے تھے ' روشنی کے اس دھبے سے سر نیہوڑائے اٹھے اور چلے گئے۔

ایک نئی صبح کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر اذان کی آواز گونجی تھوڑی دیر میں یہ

چھوٹا سا پہاڑی قصبہ کروٹ لے کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے لڑکوں نے پانی کی ریڑھیاں کھول کر چشموں کا رخ کیا۔ سیر کے چند شائقین تازہ ہوا کے لمبے لمبے سانس کھینچتے ہوٹل کے کمروں سے سڑک پر نکل آئے تھے۔ چائے والے اور نانبائی جمائیاں لیتے ہوئے چولھے گرم کر رہے تھے۔ ہم دریائے سوات پر پرانی طرز کے لکڑی کے کوئی تین فٹ چوڑے پل پر جا کر کھڑے ہو گئے جو اس قصبے کو مقابل کے پہاڑ سے ملاتا تھا۔ ہاتھ کی ہتھیلی پر پھیلی لکیروں کی طرح اونچے پہاڑ پر سیاہ پتھروں اور چٹانوں کے درمیان پھیلی پگڈنڈیوں پر اکا دکا پہاڑی لوگ کندھوں پر چادریں اور سروں پر کپڑے کی گول ٹوپیاں دھرے اپنے اپنے رزق کی تلاش میں قصبے کی جانب آہستہ آہستہ اترے چلے آتے تھے۔ مشرقی پہاڑ سے سرخی آمیز اجالا روکے نہ رک رہا تھا۔ نیچے ہلکے سرمئی رنگ کے موٹے موٹے دھارے ایک دوسرے میں گھستے' دھکم پیل کرتے' غائب ہو جاتے اور پھر بہت بڑے بڑے کھلے ہوئے پھولوں کی شکل اختیار کرتے سطح آب سے یکدم ابھرتے اور پھر پانی کی سطح پر پھسلتے ہوئے کھلتے اور پھیل جاتے' سامنے قصبے کے درجہ بدرجہ آگے پیچھے کھڑے مکانوں کے صحنوں کی بغلوں سے پانی اس طرح دیوانہ وار اچھل رہا تھا جیسے ان مٹی سے لپے ہوئے لکڑی اور پتھر کے چھوٹے چھوٹے پہاڑی گھروندوں کا بوجھ نہ سہارتے ہوئے مکانوں کی نیچے کی زمین سے چشموں کی ایک فصل پھوٹ پڑی ہو۔ پھر پانی چھوٹی چھوٹی نالیوں میں بٹ کر تیزی سے دریا وِل ندی میں گر رہا تھا۔ ندی اپنے پورے بدن پر نقرئی کف کے پھندنے سجائے عین پل کے نیچے دریائے سوات کے ملاپ کے لئے یہ سوچ کر والہانہ دوڑی آ رہی تھی جیسے یہ سانولا اس گوری رادھا کی برہا میں پتہ نہیں کب سے کتنا بیاکل اور بے چین ہو گا۔ کرشن اپنا دائیاں بازو اٹھا کے رادھا کو روک دیتے ہیں۔ وہ ایسے سواگت پر نادم ہو کر ٹھٹھک سی جاتی ہیں۔ مات پتا کا گھر تیاگ کر آنے والی رادھا واپس جائیں تو کیوں کر۔ ایک طرف کونے میں لگ کر چھوئی موئی سی بنی' اٹھے ہوئے سانولے بازو کو چومتی ان کے پہلو میں خاموشی سے راستہ بنا کر اس جگہ اتر جاتی ہیں جہاں سے حوا کو بنانے کے لئے پسلی نکالی گئی تھی۔ رادھا کنہیا کے سنگ قدم ملا کر بس دو ہی قدم چلی ہوں گی کہ ان کا گورا رنگ بھی اسی سانولے رنگ میں رنگا گیا:

رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی

رادھا اگر چوکھٹ سے لگی سسکیاں بھرتی ہیں تو بھرتی رہیں وہ شو کی طرح بے پناہ قوت سے ناچتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا جاتا تھا ۔ کون پاروتی کیسی رادھا اور کہاں کا کرشن ؟ اسے تو اپنا ازلی وچن نبھانے کے لئے مقررہ وقت پر کسی جگہ پہنچنا تھا اور یہ اٹل تھا۔

اے دریا ! تجھے انسان نے سب سے پہلے کب دیکھا ہو گا ؟ ہزاروں سال پہلے اور تو اس کی آمد سے بھی پتہ نہیں کتنے ہزار سال پہلے سے اسی طرح ان مضطرب دھاروں کو اپنے بے پناہ ضبط کے زور پر کناروں بیچ و بائے دوڑتا رہا ہوگا ۔ تجھے کیا اس آنکھ کا انتظار تھا کہ وہ آئے اور تجھے دیکھے اور اپنے دل کے ایسے ہی مضطرب دھاروں کو تیرے واسطے سے پہچانے ۔ تیری وادی میں پھیلے گھنے سر سبز جنگلوں نے سب سے پہلے جس دو پاؤں پر کھڑے ہو کر چلنے والے کو دیکھا شاید وہ کوئی آریہ ہو گا جو اپنے غول سے بھٹک کر مسلسل ، متواتر ، کبھی نہ تھمنے والے شور کے سحر میں پھنسا اندھیرے میں چلنے والے چور کی طرح سرکتا سرکتا ، دھیرے دھیرے ، احتیاط سے پاؤں دھرتا ، تیرے ارد گرد پھیلے نظاروں کو ویران آنکھوں سے نگلتا ، کسی موٹے تنے والے شجر یا بڑی چٹان کے پیچھے کھڑا دور سے بہت دیر تک دیکھتا رہا ہو گا ۔ پھر تیرا سامنا کرنے کی جرات کے لئے اپنے پورے گروہ کو تیرے کناروں پر لے آیا ہو گا کیونکہ ہم انسان ایسا ہی کیا کرتے ہیں ۔ انہوں نے گھبرا کر تجھی کو خدا مان لیا ہو گا اور صدیوں تک پوجا ہوگا ۔ جب انہوں نے تجھے مانا تو کیا تو اسی طرح اپنی دھن میں دوڑتا رہا یا لحظے بھر کے لئے رکا ، مسکرایا اور پھر چل پڑا ؟ مگر کہاں ! تو تو خود وقت ٹھہرا ۔ اپنی منزل دوسروں کے لئے کہاں کھوٹی کرتا ہے ۔ تیرے ہی کناروں پر کسی آریہ کوی کے تھرتھراتے ہونٹوں پر رگ وید کے پہلے اشلوک کے الفاظ بھٹکتے ہوئے ، لڑکھڑاتے ہوئے نازل ہوئے ہوں گے ۔ ایرانیوں نے تیرے کنارے پر پوتر اگنی جلا کر اس کو سجدے کئے ہوں گے ۔ تو ہنسا نہیں کہ اس اگنی کو سجدے ہو رہے ہیں کہ جس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو تیرا ذرا سا لمس یوں مٹا دیتا جیسے کبھی جاگے ہی نہ تھے ۔ متکبر جنگجو یونانی تیرے محافظ پہاڑوں کی چوٹیوں پر زیوس کو پکارتے اسے نذرانے بھینٹ کرتے ، تلواریں لہراتے ، تیزی سے آئے ہوں گے اور پھر خون سے بھری تلواریں میانوں میں ڈالے سمندر کے جزر کی طرح لہر در لہر واپس پلٹ گئے ہوں گے ۔ پھر

پورے تن پر ایک پیلی چادر لپیٹے گھٹے ہوئے سروں والے عاجز بھکشو بدھ کا انسانیت کے نام نروان کا پیغام پہنچانے یہاں آئے ہوں گے ۔ ہر در پر سیس نواکر بھکشا لینے والوں کے آگے بڑھتے ہوئے کشکولوں کو بھوجن سے بھرتے سمے جب وہ اپنی چوکھٹ پر کھڑی ہوتی ہوں گی تو سرسوں کے مرجھائے پھولوں جیسے چہروں پر گلوں کا رنگ پھیل جاتا ہو گا اور کڑاہی گوشت کی خالی کڑاہی جیسی کالی آنکھیں خالی تو نہ ہوتی ہوں گی ۔ ان میں تقدس اور پریم کا رس چھلک رہا ہوتا ہو گا اور تو اس وقت بھی اسی طرح شور مچائے جاتا ہو گا مسلسل متواتر کبھی نہ تھمنے والا ۔

کہتے ہیں کہ یہ امن کے مہم جو راہ روکے کھڑے پہاڑوں کو عبور کرتے انسان کے ساتھ ازل سے چمٹے دکھ کے مداوا کے لئے مہا آتما کے آٹھ اصول بتانے اور قانون کے پہیئے کا چکر سمجھانے یہاں سے تبت پہنچے ۔ اسی باعث آج تک وہاں کے باسی تیری وادی کو متبرک سمجھتے رہے ۔ اس کے بعد رامائن کا جپ کرنے والے اور کرشن کی مہما گانے والے بھکشوؤں کے نقوش پا مٹانے کے لئے پھر ایک بار تیرے کناروں پر پہنچے ۔ اب کے تو خدا نہیں تھا ۔ ان کے آگے بڑھتے تصور نے اپنے لئے بھگوان تخلیق کر لیا تھا اور سہولت کے لئے اپنے ہی جیسے انسانوں کی صورت میں اسے آسمانوں سے پکڑ کر دھرتی پر اتار لیا تھا ۔ سونے مندروں میں گھنٹیاں بج اٹھیں ۔ برہمن تلک لگا کر علم و فن پر قابض ہو گئے ۔ آج کی کالی چادروں میں چھپے چہرے کل دیو داسیاں بنے اوتاروں کے بتوں کے آگے ناچ رہے تھے اور نٹ راج کا دل لبھا رہے تھے ۔ وشنو سے جیون کی پرارتھنا کر رہے تھے ۔ پھر یہ سب کالعدم ٹھہرا اور اذان کی آواز ابھری جیسے جیسے وہ بلند ہوتی گئی کچھ مندر زمین سے آ لگے ۔ کچھ نے مسجدوں کا روپ دھارنے میں عافیت جانی ۔ گھنٹیاں بہرطور خاموش ہو گئیں مگر دیو داسیاں غزنی کے بازاروں میں بکتی رہیں ۔ اذان کی صدا تیری وادی میں آج بھی گونج رہی ہے جو میں نے ابھی سنی تھی ۔ ان میں سے جو بھی نیا آیا سچا تھا جو چلا گیا جھوٹا تھا مگر تو صرف شور مچاتا رہا ۔ مسلسل ' متواتر ' کبھی نہ تھمنے والا ۔ دریا ! تو تو مستقبل سے اس طرح واقف ہے جس طرح کوئی حال کے لمحے سے واقف ہوتا ہے ۔ خاموشی سے میری بات سن ۔ اب آنے والے زمانوں میں تیرے کناروں پر کون سی لیلا کھیلی جائے گی ' ذرا پردے کا کونا ہٹا کر اس تصویر کی جھلک تو دکھائے تو یوں ہی شور مچاتا رہے گا ۔

ایک موقع پر دریاول ندی مجھے بہت یاد آئی بلکہ بار بار آئی' ہوا یوں کہ واپسی پر ہم بدین سے کوئی پانچ چھ میل منگورہ کی طرف گئے ہوں گے کہ ہمیں دور دریا کے کنارے پر ایک ہوٹل نظر آیا۔ ہم وہاں جانے کے لئے ویگن سے اتر گئے اور دریا کی جانب کوئی ایک میل پیدل گئے تو پل آگیا۔ ہم پل پر سے گزر کر دوسرے کنارے چلے گئے اور پل کے ساتھ ہی عین دریا کے کنارے پر واقع دو منزلہ ہوٹل میں جا پہنچے اس ہوٹل کے بالمقابل دریا کے پار کنارے پر ایک کوٹھی تھی۔ اس کی ملحقہ چند ایکڑ اراضی کے ایک کونے میں لمبی سی بیرک بنی تھی جس میں مسافروں کے قیام کا بندو بست تھا اور اسی سبب اسے موٹل کا نام دیا گیا تھا۔ موٹل میں مشرق بعید کی دو لڑکیاں ' تنگ جینز پہنے ' لمبے ' سیدھے ' کالے سیاہ بالوں کو سنبھالتی کپڑے نچوڑ نچوڑ کر رسی پر پھیلانے میں منہمک تھیں۔ وہاں اس ہوٹل اور موٹل کے علاوہ آس پاس کوئی انسانی آبادی نہ تھی۔ کئی سالوں کے بعد دوبارہ چلائے جانے والے اس ہوٹل میں ہم پہلے گاہک تھے۔ بیس پچیس کمروں کا ہوٹل خالی پڑا تھا۔ ہم نے دوسری منزل پر آخری کمرہ اپنے لئے پسند کیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم دو روز وہاں ٹھہریں گے۔ سامان رکھنے کے بعد ہم برآمدے میں اپنے کمرے کے سامنے کرسیاں بچھا کر خاموش بیٹھ گئے کمرے کے ساتھ ہی سیب اور خوبانیوں کا باغ شروع ہو جاتا تھا۔ سیب کا ایک درخت جس پر چھوٹے چھوٹے سبز رنگ کے سیب لگے تھے' بالکل ہماری کھڑکی کے نیچے تھا۔ ہم جب بھی کمرے میں جاتے تو اس کی ایک شوخ ٹہنی ہماری کھڑکی کے شیشے کے ساتھ گال لگائے نہایت معصومیت سے اندر جھانک رہی ہوتی۔ نیچے دریا تھا' سر پٹختا ' شور مچاتا (ہم کرسیوں پر بیٹھے پورے ماحول کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہے تھے) پھر مٹیلی تھا اور بہت دور پیچھے سڑک جس پر کھلونوں جیسی گاڑیاں رینگتی رہتی تھیں۔ سڑک سے دور اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جنہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی بہت بڑی سبز رنگ کی طوفانی لہر منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ چھوٹی پہاڑیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ' ایڑیاں اونچی کرکے پنجوں کے بل کھڑی اونچی ہونے کی کوشش کرتی دکھائی دیتیں تاکہ بادل ان کی طرف بھی متوجہ ہو۔ مگر وہ متوالا تو جب بھی آتا ہر بار بے نیازی سے ان کے اوپر سے گزرتا سیدھا میاندرم کی بلند و بالا چوٹی سے جا کر لپٹ جاتا۔ جی بھر کر رونے سے طبیعت جب ہلکی ہو جاتی تو بھاپ کی صورت ایک آہ

سرد بنا آہستہ آہستہ بکھر جاتا اور سامنے پہاڑ کے چہرے پر شیشے جیسی لکیریں رواں ہو جاتیں ۔ یہاں دریا کے دونوں کناروں پر چاول اور مکئی کے ہرے بھرے کھیت پھیلے تھے اور دور کہیں کہیں کسان دوہرا ہو کر کام کرنے کی صورت میں اپنی رائے زنی سے فطرت کے معمول کے بہاؤ میں رخنہ اندازی کرنے کی کوشش کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

شام جب ذرا گہری ہوئی تو پورے ماحول میں اداسی بھی ذرا گہری ہو گئی ۔ سامنے کوٹھی کے دریا کی جانب بڑھے آتے سبز صحن میں دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔ اس صحن میں ہرا بھرا سیب کا ایک درخت بھی کھڑا تھا ' یہ دو بھی کھڑی تھیں۔ ہم اسی طرح اپنے خولوں میں بند رہے ۔ وہ اچھل اچھل کر کچے سیب توڑنے لگیں اور پھر انہیں پلوؤں میں جمع کر کے پتھروں کی بنی حد بندی کی دیوار کے قریب کھڑی ہو کر ایک دوسرے کے مقابلے میں کہ کون دور تک پھینک سکتا ہے دریا میں پھینکنے لگیں ۔ پھر دیوار سے اتر کر پہلے دریا کے کنارے ادھر سے ادھر مٹکتی رہیں بعد میں دریا کے اندر کنارے کے ساتھ ساتھ پڑے بڑے بڑے پتھروں پر ایک سے دوسرے پر چڑیوں کی طرح پھدک پھدک کے جانے لگیں ۔ ہم اپنے خولوں میں بند نیچے بہتے دریا اور دور پھیلے پہاڑوں میں منہمک رہے ۔ اس کھیل سے تنگ آ کر وہ واپس اپنے صحن میں چلی گئیں ۔ کچھ آپس میں چھینا جھپٹی ہوئی ۔ جس کے دوران گاہے گاہے دزدیدہ نگاہوں سے ہماری طرف بھی دیکھا گیا۔ پھر وہ ہنستے ہنستے گھاس پر لیٹ گئیں ۔ میرے ساتھی نے چونکتے ہوئے کہا "یہ ہمیں کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہیں" ۔

" یہ ہمیں کچھ کہنے کی کوشش نہیں کر رہی ہیں ہماری کھڑکی کے نیچے سیب کا درخت ہے نا اور اس کی ایک شوخ ٹہنی ہے ۔ یہ بس اسی طرح کی دو شوخ ٹہنیاں ہیں اور ایسے ہی شرارتاً" بند کھڑکیوں سے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کر رہی ہیں تم بلاوجہ اپنا سکون برباد نہ کرو" ۔

اس نے " اچھا " کہہ کر پھر ٹیک لگا لی ۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ وہ دیوار پر آ کر دو بلیوں کی طرح نہایت اداس اور چپ چاپ بیٹھ گئیں ۔ بہت دیر تک مجسموں کی طرح ساکت ' دریا کو بیٹھی گھورتی رہیں اور جب اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا کہ ان کی جگہ صرف دو سائے رہ گئے تو وہ دیوار سے اتریں اور ان کے ہاتھ ماتھوں تک گئے اور وہ آہستہ آہستہ قدم دھرتی ' روشنی سے چمکتی کھڑکیوں والی کوٹھی کے اندر چلی گئیں ۔

جانی چلایا "دیکھا! میں نہ کہتا تھا"۔
پتہ نہیں کیوں میری آنکھیں یوں شدت سے بھنچ گئیں جیسے انتہائی کھٹے لیموں کے رس سے میرا منہ بھر گیا ہو۔ شاید اس لئے کہ میں اپنے آپ کو اس عمر میں فلرٹیشن کے زیادہ منجھے ہوئے اور سنبھلے ہوئے انداز کا حقدار سمجھتا تھا۔ شاید میں اسے گہرا طنز بلکہ بھرپور تضحیک سمجھایا ان کے فرسودہ طریقے پر ردعمل تھا مگر طریقہ تو کوئی فرسودہ نہیں ہوتا صرف آدمی فرسودہ ہو جاتا ہے۔ ذرا اتنے بہت سے سالوں کی گرد جھاڑ کے دیکھو کتنے ایسے سلام کئے، جن میں سے کچھ کے جواب آئے اور باقیوں کے ابھی آنا باقی ہیں۔ یہ سب خیالات ایک ثانیہ میں میرے دل سے گزر گئے میں نے ایک قہقہہ لگایا "اوہ! بے چاری دریاول ندیاں۔ کام دیو تو کام دیو ہے اور رہے گا چاہے درمیان میں دریا کا دوسرا کنارہ رومانی فریب دہی کی روایتی چال ہی کیوں نہ چل جائے"!
جانی سینہ پھلائے اپنی بات پر مصر تھا "اب بتاؤ"۔
"جانی! وہ بے وقوف لڑکیاں دراصل دریاول ندیاں ہیں جنہیں کسی سوات کی تلاش ہے کہ اس کے پہلو میں اتر کر اپنے آپ کو اس میں ضم کر دیں۔ وہ اپنے کچے پن، دھندلکے اور فاصلے کی وجہ سے ہمیں سوات سمجھ بیٹھیں اور تم جانتے ہو کہ ہم سوات نہیں ہیں۔ میدان میں دھیرج سے بہتے ہوئے راوی ہیں۔ آؤ یہاں سے بھاگ چلیں ورنہ ان کے خواب اس دھماکے سے ٹوٹیں گے کہ ہمارے کانوں کے پردے بھی اڑ جائیں گے"۔
ہم واقعی دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے وہاں سے چل دیئے۔ پل پر سے گزرتے ہوئے ذہن میں یہ خیال گھوم گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اب کے بس نکل جانے کی بجائے، بس کو کھڑے چھوڑ کر میں خود نکلا جا رہا ہوں۔ تیزی سے پل کے نیچے سے گزرتا ہوا، آگے ہی آگے بڑھتا ہوا، لوٹ کر کبھی نہ دیکھنے والا سوات غل مچائے جا رہا تھا ----- مسلسل ----- متواتر ----- کبھی نہ تھمنے والا ---!

کھیل اور کھلونے

اتوار کا دن تھا اور میں صبح دس بجے تک بستر میں بلاوجہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے دیکھ لیتا تھا کہ میری بیوی صرف نائلون کا ایک ڈھیلا ڈھالا سفید گاؤن پہنے شڑاپ سے کبھی غسل خانے میں جا گھستی' وہاں سے نکلتی تو باورچی خانے میں چلی جاتی' وہاں سے نکلتی تو بیڈ روم میں رکے بغیر اپنے پیچھے گاؤن اڑاتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف پرواز کرتی نظر آتی۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ اس وقت اپنے آپ کو باغ میں اڑتی پھرتی سفید تتلی سمجھ رہی تھی اور حقیقی دنیا میں ناشتہ تیار کر رہی تھی' مکان کی ہفتہ وار صفائی کر رہی تھی اور دوپہر کھانے پر مدعو مہمانوں کے لئے انتظامات کر رہی تھی۔ میں نیند کی آڑ لے کر بستر میں چھپا ہوا تھا مگر دل میں برابر یہ خیال گھوم رہا تھا کہ ابھی آکر کہے گی "اٹھو! مجھے بستر کی چادریں تبدیل کرنی ہیں" پھر تیوری چڑھے گی اور ازلی شکایت دہرائی جائے گی "خدارا کبھی تو خود احساس کرتے ہوئے کام میں ہاتھ بٹا دیا کرو" میں نے سوچا فی الحال بستر میں دبکے رہو' جو لمحہ آرام میں کٹ جائے وہی اچھا' جب مصیبت سب بند توڑ کر سر پہ آہی پڑے گی تو دیکھا جائے گا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا اس نے اپنی اڑان کے دوران ایک مرتبہ رک کر کہا "نیند نہیں آرہی تو کیوں بیکار کروٹیں لئے جا رہے ہیں۔ اور کچھ نہیں کرنا تو اٹھ کر اخبار ہی پڑھیں" فقرے کی زبان و بیان میں اس نے ٹھسا ٹھس طنز بھرا تھا مگر میں نے لفظی مفہوم پر جاتے ہوئے بستر سے نکل کر ڈریسنگ گاؤن پہنا اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ

کر واقعی اخبار پڑھنا شروع کر دیا وہ پھر ادھر سے اڑتی ہوئی گزری تو مجھے یوں صاف ضمیر کے ساتھ پر سکون بیٹھے دیکھ کر ' نتھنے پھلا کر ' منہ دوسری طرف پھیر کر ' آگے بڑھ گئی مجھے اس روز پہلی مرتبہ شائبہ سا گزرا کہ جیسے اس کی گردن کی جلد ذرا ڈھلک گئی ہو اور اس پر جھریاں سی نمودار ہو رہی ہوں میں نے فوراً اٹھ کر پڑھنے والا چشمہ تلاش کر کے لگایا اور آئینے میں اپنا چہرہ اور خاص طور پر گردن کا نچلا حصہ بغور ملاحظہ کیا میں تو بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہمیشہ سے اپنے آپ کو دیکھتا چلا آرہا تھا۔ صرف ایک چشمہ زائد تھا اور سر پہ بال کچھ کم ہو گئے تھے آنکھوں کے کونوں سے کنپٹیوں کی طرف دوڑنے والی چند ایک لکیریں ظاہر ہو گئی تھیں لیکن انھیں تو میں سیاہ چشمے سے بخوبی چھپا سکتا تھا باقی ویسے کا ویسا ہی تھا کم از کم گردن پر جھریاں تو نہ تھیں اتنے میں وہ پھر اڑتی ہوئی ادھر آنکلی میرے اس قدر گمبھیر موڈ میں آئینہ دیکھنے پر ہنس پڑی "کیا آپ چہرے کا کوئی نیا حسین زاویہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ مجھ سے پوچھ لیں ' سب یاد ہیں"

"نہیں ' دانت دیکھ رہا ہوں اندر سے بہت سیاہ ہو رہے ہیں" یہ کہتے ہوئے میں واقعی منہ کھول کے اندر سے دانت دیکھنے لگا۔

"چلو کوئی بات نہیں اندر کی طرف برش ذرا زیادہ رگڑ لیا کریں اور سگرٹ کم پیا کریں"

باتوں کے دوران میری نظر اور توجہ اس کی گردن پر مرکوز تھی۔ بالکل صاف تھی ' ہمیشہ کی طرح وہ باورچی خانے کی طرف پرواز کر گئی مجھے شک سا گزرا جیسے میں ٹھیک سے اس کی گردن دیکھ نہیں سکا میں نے کہا ' سنو ' وہ واپس آئی اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی میں نے پوری گردن کا پھر سروے کر ڈالا اور یونہی بات بنانے کے لئے پوچھا "کھانا دو بجے تک تو تیار کر لو گی؟"

"ہاں ہاں مہمانوں کے آنے سے پہلے میں اس کام سے فارغ ہو چکوں گی تاکہ ان کے پاس آرام سے بیٹھ تو سکوں" یہ کہتے ہوئے اس نے شاید اتوار کی صبح کا اضافی فائدہ اٹھانے کے لئے کچھ آنکھیں مٹکائیں اور نائلون کے ناکام عمل گاؤن کو گردن کج کرتے ہوئے کچھ اور ناکام بنانے کی کوشش کی مگر میں پڑھنے کا چشمہ لگائے ' پھول کی طرح ایک ہی جگہ ٹکٹکی باندھے گردن کا دوبارہ معائنہ کرنے میں کچھ ایسا محو تھا کہ بے

چاری مایوس ہو کر وہاں سے کچھ یوں گئی کہ اب نہ وہ اپنے لئے سبک پروں والی تتلی رہی تھی اور نہ میں اس کے لئے شوخ پھول رہا تھا۔ بس سیدھے سادے ثریا اور جاوید تھے معائنہ کامیاب رہا اور میری سمجھ میں آگیا کہ وہ سب میرا وہم تھا۔ نہ تو ابھی جلد کہیں سے ڈھلکی تھی اور نہ ہی کوئی جھریاں پیدا ہوئی تھیں۔

میں پھر اخبار لے کر کرسی پر بیٹھ گیا کہ آج سے بیس سال پہلے جب میں بائیس سال کا تھا تو لندن انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے آیا تھا یہاں پہنچنے پر اتنے بہت سے کام نکل آئے تھے کہ تعلیم کی طرف توجہ ہی نہ ہو سکی جب تک گھر سے رقم آتی رہی ادھر ادھر انجینئرنگ کے تعلیمی اداروں میں داخلے لیتا رہا۔ چند سال بعد انھوں نے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا تو میں نے بھی داخلے لینے بند کر دیئے اور پاکستانی انجینئرنگ سند کے زور پر ایک کارخانے میں ملازمت کر لی۔ تنخواہ ٹھیک تھی میری پھر سے خوب گزرنے لگی۔ اب ان لوگوں نے خطوط اور پیغامات کا تانتا باندھ دیا کہ "واپس آجاؤ" بالکل یوں لگا گویا یہ جان کر ان کے ذہنوں میں ایک خلجان بپا تھا کہ آخر یہ شخص کیوں ایک گوشے میں سکھی بیٹھا ہے کیوں نہ یہ بھی اس ہڑبونگ میں آکر بوٹیوں اور شوربے پر تو تکار کرے میں انجان بنا رہا اور اپنا فش اور چپس کھاتا رہا روز روز وہی فش اینڈ چپس کھاتے کھاتے جی اوب جاتا ہے مگر پورا لفافہ اطمینان سے اکیلے کھانے میں بھی بڑا نشہ ہوتا ہے۔ ایک دن اطلاع آئی کہ جلد آکر شادی کر جاؤ کیونکہ والدین کو حج پر جانا ہے۔ دس دن تک واپس آجاؤ نہیں تو ابا جی تمہیں لینے کے لئے لندن پہنچ رہے ہیں۔ مجھے سخت الجھن ہوئی کہ حج پر انھیں جانا ہے اور شادی میری کرا رہے ہیں۔ دھمکی بڑی سخت تھی۔ ابا جی واقعی اگر آجائیں تو انھیں یہاں "اولڈ ہاؤس" میں بھی جمع نہیں کرایا جا سکے گا (محض غیر قومیت کے ہونے کی وجہ سے) میں چلا گیا اور یہ سوچ کر اس کو بیاہ کے لے آیا کہ پاکستانی ہے کچھ عرصہ تو روایتی طور پر اپنی بے زبانی نبھائے گی۔ اب تو اس بات کو بھی پندرہ سال ہونے کو آئے ہیں۔

شروع شروع میں مجھے اس پر ترس آتا تھا جیسے یہ کوئی احمق پلا ہو جو پر شور بازار کے ہجوم میں اپنے کھوئے ہوئے گھر کی تلاش کر رہا ہو لیکن ہوا یہ کہ آہستہ آہستہ میں خود ہی افیون کی طرح اس کا عادی ہو گیا۔ تین، چار سال گزر گئے مگر کوئی بچہ نہ ہوا یہ اس طرح محسوس کرنے لگی جیسے وقت آنے پر سب کی دمیں باری باری نکل آئی

ہوں ' صرف اس کی رہ گئی ہو سال دو سال علاج معالجے میں نکل گئے ' آخر ڈاکٹروں نے کورا جواب دے دیا کہ اس کے بچہ ہو ہی نہیں سکتا مجھے ایک خوشی تھی کہ نقص اس میں نکلا مجھ میں نہیں ' اب خود ہی بھگتے گی جس نے بچے کا زیادہ شوق لگا رکھا تھا مگر اس کے بعد تو وہ مجھ پر اس طرح ٹوٹ کر گری جیسے صدیوں پرانا بڑ کا درخت آناً فاناً" آندھی نے اکھاڑ کر مجھ پر لاد دیا ہو۔ میری تو سانس بند ہو گئی۔ اب کیا ہو گا؟ بچہ اس کے نہیں ہوا اور محبت کے سیلاب میں غرق ہو کر مارا جاؤں گا میں اور وہ بھی ایسی موت کہ جس کی نہ کوئی شان ہو گی نہ شوکت ' نہ کسی کو تاسف نہ رنج؟۔ کیا کیا جائے میں نے اسے سکول میں ملازم کرا دیا اور ہر شام اس کا دل بہلانے کے لئے اسے مخلوط پارٹیوں میں لے کر نکل جاتا۔ سال بھر میں وہ جو اسے ہر وقت میرا ہوکا لگا رہتا تھا وہ کچھ کم ہو گیا۔ لیکن اب بھی راتوں میں واپسی پر کبھی کبھی رو رہی ہوتی۔

میں ان خیالات میں گم تھا کہ آخبار میں ایک عجیب اشتہار نظر سے گزرا عنوان تھا "کیا آپ کو بچے کی ضرورت ہے" اور نیچے درج تھا "ایک جوڑا جو نیم براعظم ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے کچھ مدت کے لئے لندن میں مقیم ہے۔ انھیں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت ہے اور اپنی اس عظیم محبت کی نشانی کے طور پر ایک بچہ پیدا کرنے کے لئے بے قرار ہیں لیکن چونکہ دونوں الگ الگ سے شادی شدہ ہیں اور تین تین بچے ان کے ہیں اس لئے پہلی شادیوں کو ختم کرنے پر بھی کسی طرح اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پائے۔ اگر کوئی بے اولاد جوڑا پہلے دن سے بچے کو کلی طور پر اپنی اولاد بنانے پر رضا مند ہو تو وہ یہ ارتکاب عمل کریں گے یقین دلایا جاتا ہے کہ دونوں زن و مرد قبول صورت اور ہر قسم کے بدنی عیب سے پاک اور اونچے درمیانہ درجے کی ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہیں البتہ اگر بوجہ کار قدرت بچے میں کوئی عیب ہوگا تو اقرار کرنے والا جوڑا بہر طور اسے قبول کرنے کا پابند ہو گا۔ مزید تفصیلات اور شرائط کے لئے مندرجہ ذیل پتے پر رجوع فرمائیے" نیچے کسی قانونی فرم کا نام دیا ہوا تھا

میں نے آواز دی "ثریا!"

"کیا ہے" وہ باورچی خانے سے بولی

"ادھر آؤ۔ جو کچھ بھی کر رہی ہو بس چھوڑ دو ' ادھر آجاؤ"

وہ ایرن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی آکر کھڑی ہو گئی۔

"یہ پڑھو"

اس نے ایک بار پڑھا ' پھر دوسری بار پڑھا "معلوم ہوتا ہے ایسے ہی کسی نے مذاق کیا ہے"

میں پڑھنے کا چشمہ ہاتھ میں جھلاتے ہوئے اسے کہہ رہا تھا " ثریا! تمہیں کیا خبر کہ لوگوں کی کتنی عجیب عجیب حسرتیں اور تمنائیں ہوتی ہیں ان کے ذہنوں میں خدا معلوم کیا کیا چھپا ہوتا ہے۔ یہ ایک اچھا موقعہ ہے ہمیں اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ تعجب ہے ' یہ پڑھ کر تمہارے جذبات میں کوئی ہیجان بپا نہیں ہوا"

"ہو رہا ہے" یہ کہہ کر وہ پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔

دوسرے دن ہم آخبار میں دیئے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئے۔ ایک انگریز وکیل کا دفتر تھا۔ انھون نے غالباً کسی دیسی کو اعتماد میں لینے سے دانستہ گریز کیا تھا ہمیں دیکھ کر وکیل مسکرا دیا "بچے کے لئے ؟"

"ہاں"

"بے اولاد ؟"

"ہاں"

"ہندو یا مسلم ؟"

"مسلم"

"ٹھیک ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک فارم مجھے پکڑا دیا " یہ فارم آپ دونوں کو پر کرنا ہو گا اور مطلوبہ سرٹیفکیٹ ساتھ شامل کرنا نہ بھولئے گا اور فارم کے آخر میں جو بیان حلفی ہے وہ کسی جسٹس آف پیس یا نوٹری پبلک کا مصدقہ ہونا چاہئے۔ خیر اس کے بارے میں آپ متفکر نہ ہوں۔ وہ میں کرادوں گا۔ فارم پر کرکے معہ سرٹیفکیٹوں کے کل شام تک ضرور پہنچا دیجئے کیونکہ اس کے بعد ہم مزید درخواستیں قبول نہیں کریں گے پہلے ہی بہت آچکی ہیں اور کچھ معلومات درکار ہوں تو کل بھی فراہم کی جا سکتی ہیں۔ نصیب آپ کی یاری کرے شکریہ! ہاں! آپ دونوں کو اپنا ایک ایک فوٹوگراف بھی مہیا کرنا ہے" ہم نے اس سے ہاتھ ملایا ' الوداع کی اور سیدھے گھر پہنچ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر فارم پر کرنے میں یوں جت گئے جیسے وہ بھی کوئی جنسی عمل ہو جس کے نو ماہ کے بعد بچہ تولد ہوتا ہے۔ یہ غالباً پہلی مرتبہ تھا کہ

میں پڑھنے کا چشمہ لگا کر تولید کے کام میں مصروف تھا حالانکہ اس کے لئے دور کے چشمے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی پر شدہ فارم کچھ یوں پڑھا جاتا تھا۔

ہم جاوید احمد اور ثریا جبیں سکنائے مکان نمبر........

دونوں بالترتیب بعمر ۴۲ سال اور ۳۷ سال ہیں اور دونوں قانونی اور مذہبی لحاظ سے میاں بیوی ہیں۔ ہم پاکستانی الاصل مسلمان ہیں اور انگلستان کے شہری حقوق ہمیں حاصل ہیں۔ ہم بے اولاد ہیں اور ہم دونوں کی فردا" فردا" کسی اور شادی سے بھی کوئی اولاد نہیں اور نہ ہی اس امر کا امکان ہے کہ ہمارے ہاں آئندہ کوئی اولاد ہو سکے۔ بطور ثبوت سمر جانسن ہسپتال لندن کا جاری کردہ سرٹیفکیٹ شامل فارم ہذا کیا جاتا ہے جاوید احمد کی ماہانہ آمدن چار صد پونڈ ہے اور ثریا جبیں کی ماہانہ آمدن اسی پونڈ ہے بطور ثبوت آجروں کے سرٹیفکیٹ لف ہیں ہم دونوں حلفاً بیان کرتے ہیں کہ میسرز سمتھ اینڈ کمپنی قانونی مشیران لندن کی وساطت سے مشتہر کنندہ جوڑے کا بچہ آج سے بارہ ماہ کی مدت تک قبول کرنے اور متبنی بنانے کے پابند ہوں گے چاہے وہ بچہ جسمانی یا ذہنی یا دونوں اعتبار سے معذور ہی کیوں نہ ہو ہم دونوں حلفاً بیان کرتے ہیں کہ بچے کو ہر لحاظ سے مثل اپنی صلبی اور بطنی اولاد کے پالنے پوسنے کے پابند ہوں گے ہم اقرار کرتے ہیں کہ بچہ اگر نر ہوا تو اس کا پہلا نام شہرزاد اور اگر مادہ ہوا تو شہرزاو رکھیں گے۔ ہم دونوں بچے کے اصلی والدین کو تلاش کرنے کی کوئی کوشش کبھی نہ کریں گے اور نہ ہی بچے پر ظاہر ہونے دیں گے کہ وہ ہماری حقیقی اولاد نہیں نیز ہم دونوں میں علیحدگی ہو جانے کی صورت میں ثریا جبیں بچے کو اپنی ولایت میں رکھنے کی حقدار اور پابند ہو گی اور جاوید احمد اس کے خلاف کسی نوع کی کوئی چارہ جوئی کرنے کا مجاز نہ ہو گا آج مورخہ بارہ جون ۱۹۶۵ء کو ہم نے بلاجبرواکراہ' بدرستی ہوش و حواس اپنی رضا مندی سے یہ فارم اور بیان حلفی تحریر و تکمیل کر دیا ہے اور اس میں کوئی امر پوشیدہ نہیں رکھا گیا اور نہ غلط بیان کیا گیا ہے۔

مامقران	گواہان
جاوید احمد	۱
ثریا جبیں	۲

جب میں مکمل شدہ فارم کا متن پڑھ کر سنا رہا تھا تو ثریا تھکن سے نڈھال بستر پر

آنکھیں بند کئے پڑی تھی جب پڑھ چکا تو خاموش ہو کر اس کے تبصرے کا انتظار کرنے لگا مگر وہ کچھ نہ بولی اور اسی طرح خاموش پڑی رہی میں نے تھک کر آخر منہ کھولا "بطور گواہان رشید اور فریدہ کے دستخط کرالیں گے یا پھر وکیل پر چھوڑ دیں گے ؟" وہ انتہائی بوجھل آواز میں بولی" کیا فرق پڑتا ہے کسی سے بھی کرالینا" میں نے کہا "کل آجروں سے اور ہسپتال کے سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرنا ہیں ۔ خدا معلوم ہسپتال میں کتنا وقت لگ جائے ؟ تمہارے پاس پرانے معائنوں کے نتائج وغیرہ محفوظ ہیں نا ؟" وہ کہیں بہت دور سے عجیب تیقن اور جھنجلاہٹ کے انداز میں بولی جیسے کسی ادنی غلام سے مخاطب ہو "ہاں ' ہاں ہیں ۔ سب ہو جائے گا"

میں ابھی اس سے اور بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا ' مگر اس کی نیم بیہوشی کی حالت دیکھتے ہوئے مزید بات کرنے کا حوصلہ نہ رہا اور یہ سوچتے ہوئے نہایت سست روی سے فارم ' کاغذات ' قلم وغیرہ سنبھالنے لگا کہ شاید کوئی خوبصورت سپنا دیکھ رہی ہے یا اپنی ناکامی کا تحریری الفاظ میں اقرار کرنے سے اس کے اندر دور کہیں امید کا ٹمٹماتا ہوا دیا بھی آج بجھ کے رہ گیا ہے اور عرصے سے اس کی روح سے بندھا ناکامی کا بوجھل پتھر اب پہلی مرتبہ اسے ساتھ لئے غرقابی کے سفر پر روانہ ہو کر نیچے ہی نیچے انجانی ' اندھیری ' اتھاہ گہرائیوں میں تیزی سے اترتا چلا جا رہا ہے ۔ یا پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی ہے کہ اسے فطری عمل کا ایک جز و جو بچہ پالنے سے متعلق ہے اس کے پورا کرنے کا موقعہ مل گیا ہے یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے یہ احساس جرم ستا رہا ہو کہ وہ ایک نارمل مرد کو اس کا اپنا بچہ فراہم نہ کر سکی ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس سارے کھیل کو جنسی عمل سے مماثلت دیتے ہوئے یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ واقعی حاملہ ہو گئی ہے اور نوماہ بعد ایک جیتے جاگتے بچے کی ماں بن جائے گی (کیا ہوا اگر وہ جنم کسی اور کی کوکھ سے بھی لے) اور یوں اپنے کو پہلے کی نسبت زندگی کی دوڑ میں زیادہ مستحکم محسوس کرتے ہوئے مجھے ایک فالتو چیز سمجھتے ہوئے قدرے بے فکر اور مغرور ہو گئی ہو اس کے اندر کیا ہو رہا ہے ؟ یہ کیا سوچ رہی ہے ؟ دفعتاً" میری نظر اس کے سر کی طرف اٹھ گئی ۔ باہر تو کچھ بھی نہیں تھا ۔ وہی گھنے بال جن میں سے کچھ اس کے نیچے دبے تھے اور کچھ تکیہ پر پھیلے ہوئے تھے ۔ چاندنی جیسی پیشانی چمک رہی تھی چہرہ پر سکون تھا ساڑھی کا پلو چھاتی سے اتر کر دائیں پہلو میں ڈھیر تھا گردن پر نہ تو جھریاں

تھیں نہ ڈھلکتا ہوا گوشت تھا صرف دو چھوٹے چھوٹے بل تھے بلاوز کے اندر گھسی جاتی گہری لکیر تھی آہستہ آہستہ ابھرتا دبتا صاف شفاف نازک جلد والا پیٹ تھا پھر ساڑھی کا جنگل پھیلا تھا اور اس کے بعد اگرچہ خوبصورت مگر دو بلا تاثر کے سیدھے کھڑے پاؤں جو لگتے تھے ۔ اس جسم کا حصہ نہ ہوں بلکہ کسی نے وہاں لا کر رکھ دیئے ہوں وہ سوئی ہوئی تھی ؟ مگر اس کی سانس تو بوجھل نہیں تھی میں پلنگ کے پاس جا کر تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ تو یہ ایک عورت ہے ایک فرد جو سب سے الگ ہے اور اپنے آپ میں ایک مکمل یونٹ ہے ' اس کے اندر کیا ہو رہا ہے ؟ کہیں دوسرے مرد کے بچے کی ماں بننے کے خیال سے بدل تو نہیں گئی ؟ جب تک کھوپڑی کھول کے نہ دیکھا جائے کچھ پتہ نہیں چل سکتا چلو ! کھوپڑی سے کان لگا کر سنتا ہوں شاید ٹک ٹک کی آواز سے کوئی اندازہ ہو سکے میں نے آگے جھک کر کان اس کے سر سے لگا دیا کوئی آواز تھی ہی نہیں البتہ بالوں کی کچھ سرسراہٹ سی سنائی دی اس نے ہاتھ اٹھا کر ہلکے سے میرا چہرہ پرے کرتے ہوئے کہا "چلئے چھوڑیئے ---۔ رہنے دیجئے" اور کروٹ لے لی۔

"لباس تو بدل لو"

"نہیں"

میں کپڑے تبدیل کرنے لگا اور بوجھل محسوس کر رہا تھا جیسے گوشت پوست کی بجائے سیسے سے ڈھلا ہوا انسان ہوں اور سیسے کے بدن سے ایک غلاف اتار کر دوسرا چڑھا رہا ہوں ۔ بتی بجھائی ' کھڑکی کا پردہ ہٹایا ۔ کالے سفید ' سلیٹی بادلوں کے پیچھے کہیں بڑا سا چاند چھپا ہوا تھا ۔ روشنی کے مختلف شیڈوں کے بڑے بڑے دھبے پورے آسمان پر پھیلے ہوئے تھے اس چتکبری چادر کے پیچھے چاند خود کہاں ہو گا ؟ میں خالی ذہن سے وہاں کھڑا بہت دیر تک ایسے ہی اسے تلاش کرتا رہا۔ وسط آسمان میں بادل پھٹا تو سامنے چاند تھا۔ خوب دمکتا ہوا ۔ میرے دیکھتے دیکھتے بادل دھنکی روئی کے گالوں کی طرح ہر طرف پھیل گئے ۔ ایک ہاتھی کا بچہ 'چاند کو گویا شرارتاً" گدگدی کر کے سونڈ اٹھائے کلیلیں کرتا ہوا اس سے دور بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی پچھلی دو ٹانگیں عدم میں حل ہوئی جا رہی تھیں ۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو ٹٹولا ابھی تک موجود تھیں میں پکارا " پیارے پیارے خوش باش بچے مجھ سے کھیلو" وہ خاموش رہا اور پھر

آنکھیں بند کئے پڑی تھی جب پڑھ چکا تو خاموش ہو کر اس کے تبصرے کا انتظار کرنے لگا مگر وہ کچھ نہ بولی اور اسی طرح خاموش پڑی رہی میں نے تھک کر آخر منہ کھولا "بطور گواہان رشید اور فریدہ کے دستخط کرالیں گے یا پھر وکیل پر چھوڑ دیں گے ؟" وہ انتہائی بوجھل آواز میں بولی "کیا فرق پڑتا ہے کسی سے بھی کرالینا" میں نے کہا "کل آجروں سے اور ہسپتال کے سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرنا ہیں ۔ خدا معلوم ہسپتال میں کتنا وقت لگ جائے ؟ تمہارے پاس پرانے معائنوں کے نتائج وغیرہ محفوظ ہیں نا ؟" وہ کہیں بہت دور سے عجیب تیقن اور جھنجلاہٹ کے انداز میں بولی جیسے کسی ادنیٰ غلام سے مخاطب ہو "ہاں ' ہاں ہیں ۔ سب ہو جائے گا"

میں ابھی اس سے اور بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا ' مگر اس کی نیم بیہوشی کی حالت دیکھتے ہوئے مزید بات کرنے کا حوصلہ نہ رہا اور یہ سوچتے ہوئے نہایت سست روی سے فارم ' کاغذات ' قلم وغیرہ سنبھالنے لگا کہ شاید کوئی خوبصورت سپنا دیکھ رہی ہے یا اپنی ناکامی کا تحریری الفاظ میں اقرار کرنے سے اس کے اندر دور کہیں امید کا ٹمٹماتا ہوا دیا بھی آج بجھ کے رہ گیا ہے اور عرصے سے اس کی روح سے بندھا ناکامی کا بوجھل پتھراب پہلی مرتبہ اسے ساتھ لئے غرقابی کے سفر پر روانہ ہو کر نیچے ہی نیچے انجانی ' اندھیری ' اتھاہ گہرائیوں میں تیزی سے اترتا چلا جا رہا ہے ۔ یا پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی ہے کہ اسے فطری عمل کا ایک جز و جو بچہ پالنے سے متعلق ہے اس کے پورا کرنے کا موقعہ مل گیا ہے یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے یہ احساس جرم ستا رہا ہو کہ وہ ایک نارمل مرد کو اس کا اپنا بچہ فراہم نہ کر سکی ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس سارے کھیل کو جنسی عمل سے مماثلت دیتے ہوئے یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ واقعی حاملہ ہو گئی ہے اور نوماہ بعد ایک جیتے جاگتے بچے کی ماں بن جائے گی (کیا ہوا اگر وہ جنم کسی اور کی کوکھ سے بھی لے) اور یوں اپنے کو پہلے کی نسبت زندگی کی دوڑ میں زیادہ مستحکم محسوس کرتے ہوئے مجھے ایک فالتو چیز سمجھتے ہوئے قدرے بے فکر اور مغرور ہو گئی ہو اس کے اندر کیا ہو رہا ہے ؟ یہ کیا سوچ رہی ہے ؟ دفعتاً" میری نظر اس کے سر کی طرف اٹھ گئی ۔ باہر تو کچھ بھی نہیں تھا ۔ وہی گھنے بال جن میں سے کچھ اس کے نیچے دبے تھے اور کچھ تکیہ پر پھیلے ہوئے تھے ۔ چاندنی جیسی پیشانی چمک رہی تھی چہرہ پر سکون تھا ساڑھی کا پلو چھاتی سے اتر کر دائیں پہلو میں ڈھیر تھا گردن پر نہ تو جھریاں

تھیں نہ ڈھلکتا ہوا گوشت تھا صرف دو چھوٹے چھوٹے بل تھے بلاوز کے اندر گھسی جاتی گہری لکیر تھی آہستہ آہستہ ابھرتا دبتا صاف شفاف نازک جلد والا بیٹ تھا پھر ساڑھی کا جنگل پھیلا تھا اور اس کے بعد اگرچہ خوبصورت مگر دو بلا تاثر کے سیدھے کھڑے پاؤں جو لگتے تھے ۔ اس جسم کا حصہ نہ ہوں بلکہ کسی نے وہاں لا کر رکھ دیئے ہوں وہ سوئی ہوئی تھی ؟ مگر اس کی سانس تو بوجھل نہیں تھی میں پلنگ کے پاس جا کر تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ تو یہ ایک عورت ہے ایک فرد جو سب سے الگ ہے اور اپنے آپ میں ایک مکمل یونٹ ہے ' اس کے اندر کیا ہو رہا ہے ؟ کہیں دوسرے مرد کے بچے کی ماں بننے کے خیال سے بدل تو نہیں گئی ؟ جب تک کھوپڑی کھول کے نہ دیکھا جائے کچھ پتہ نہیں چل سکتا چلو ! کھوپڑی سے کان لگا کر سنتا ہوں شاید ٹک ٹک کی آواز سے کوئی اندازہ ہو سکے میں نے آگے جھک کر کان اس کے سر سے لگا دیا کوئی آواز تھی ہی نہیں البتہ بالوں کی کچھ سرسراہٹ سی سنائی دی اس نے ہاتھ اٹھا کر ہلکے سے میرا چہرہ پرے کرتے ہوئے کہا "چلئے چھوڑیئے ۔۔۔ رہنے دیجئے" اور کروٹ لے لی۔

"لباس تو بدل لو"

"نہیں"

میں کپڑے تبدیل کرنے لگا اور بوجھل محسوس کر رہا تھا جیسے گوشت پوست کی بجائے سیسے سے ڈھلا ہوا انسان ہوں اور سیسے کے بدن سے ایک غلاف اتار کر دوسرا چڑھا رہا ہوں ۔ بتی بجھائی ' کھڑکی کا پردہ ہٹایا ۔ کالے سفید ' سلیٹی بادلوں کے پیچھے کہیں بڑا سا چاند چھپا ہوا تھا ۔ روشنی کے مختلف شیڈوں کے بڑے بڑے دھبے پورے آسمان پر پھیلے ہوئے تھے اس چتکبری چادر کے پیچھے چاند خود کہاں ہو گا ؟ میں خالی ذہن سے وہاں کھڑا بہت دیر تک ایسے ہی اسے تلاش کرتا رہا ۔ وسط آسمان میں بادل پھٹا تو سامنے چاند تھا ۔ خوب دمکتا ہوا ۔ میرے دیکھتے دیکھتے بادل دھنکی روئی کے گالوں کی طرح ہر طرف پھیل گئے ۔ ایک ہاتھی کا بچہ 'چاند کو گویا شرارتاً' گدگدی کر کے سونڈ اٹھائے کلیلیں کرتا ہوا اس سے دور بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی پچھلی دو ٹانگیں عدم میں حل ہوئی جا رہی تھیں ۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو ٹٹولا ابھی تک موجود تھیں میں پکارا " پیارے پیارے خوش باش بچے مجھ سے کھیلو" وہ خاموش رہا اور پھر

چیتھڑا چیتھڑا ہو کر آسمان پر بکھر گیا۔

میں نے پردہ کھینچ دیا۔ یہ چاند کیا ہر وقت الو کی آنکھ بنا سب کو ٹر ٹر دیکھتا رہتا ہے۔ وہ جوڑا جو اس وقت پیار کی نشانی گھڑنے میں مصروف ہے اس کو بھی دیکھ رہا ہے اور یہ جوڑا جو پیار کی نشانی نہیں گھڑ رہا اس کو بھی دیکھ رہا ہے۔ پھر جب پیار کی نشانی زندہ ہو کر اچھلتی کودتی پھرتی ہو گی تو اس کو بھی دیکھے گا۔ پھر جب ہم سب یہ سین چھوڑ کر زیر زمیں چلے جائیں گے۔ تب یہ نئے لوگوں کو دیکھ رہا ہو گا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ نئے لوگوں کے ساتھ نیا چاند ہونا چاہیے ایسا ہی ہوتا ہے ہر نئے آنے والے کے ساتھ نیا چاند آتا ہے اور ہر جانے والے کے ساتھ اس کا پرانا چاند چلا جاتا ہے۔ وہ لوگ والنٹیر جوڑے کا آخری انتخاب تو کل یا پرسوں تک کر سکیں گے اور اس کے بعد ہی کام سنجیدگی سے شروع کریں گے میں نے دوسری طرف جا کر، جھک کر ثریا کا چہرہ دیکھا۔ چشمہ ادھر میز پر پڑا رہ گیا۔ ویسے ہی غور سے دیکھا۔ تھکن یا بیزاری کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ اپنے سپنوں کی انجمن میں اس طرح آباد نظر آ رہی تھی جیسے عشاق کی گرما گرم محفل میں کوئی نوخیز رنڈی! میں بستر کے ایک کونے میں نہایت آہستگی سے اپنا بدن سکیڑ کر لیٹ گیا۔

کاغذات وکیل کے سپرد کرنے کے بعد میرا خیال ہے کہ ہم دونوں نے پوری بات کو بالکل بھلا دیا تھا تقریباً ایک ہفتہ بعد قانونی مشیران کی جانب سے ہماری یادوں کے تالاب میں کنکر سے ایک خط گر پڑا "مبارک ہو، آپ منتخب کر لئے گئے" اس خط نے بھی دو ایک چھوٹے چھوٹے دائرے سے پیدا کئے جو تھوڑی دور چل کر پانی کی پرسکون سطح کا پھر سے حصہ بن گئے۔

فروری کی ایک شام میں دیر سے گھر پہنچا تو ثریا صوفے پر بیٹھی بچے کی اونی ٹوپی بن رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب دھچکا سا لگا۔ میں نے بناوٹی سنجیدگی سے پوچھا "کیا بچہ متحرک ہو گیا ہے"؟

اس نے شرمندہ سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "معلوم یہی ہوتا ہے کل ڈاکٹر کو دکھاؤں گی۔"

میں نے کہا "یوں ہی بلاوجہ تکلیف اٹھا رہی ہو۔ یہ ٹوپی موزے وغیرہ بازار سے بنے بنائے مل سکتے ہیں"

"جو روح ہمارے پاس آ رہی ہے اس سے کچھ ذاتی تعلق پیدا کریں گے تو انس ہو گا۔ وہ تو بازار سے بنا بنایا نہیں مل جاتا"

میں نے دیکھا کہ باورچی خانے کی الماری میں فیڈر رکھے تھے۔ میز پر بچوں کی پرورش کے بارے میں کتابیں پڑی تھیں۔ ایک کونے میں بچہ گاڑی کھڑی تھی۔ پتہ نہیں کیوں میں بجھ سا گیا۔ میں نے اس سے کہا "اری پاگل! سن۔ یہ سب مذاق تھا۔ میں نے ہی اخبار میں اشتہار دیا تھا اور وکیل جو ہماری کمپنی کا بھی قانونی مشیر ہے اسے ساتھ ملا لیا اور یہ ڈراما کر ڈالا"

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں دیکھتی رہی جیسے کونے میں عاجز آیا ہوا کوئی درندہ ہے اور موقع ملتے ہی فوراً ہی مجھ پر جھپٹ پڑے گی۔ مجھے تیس پینتیس سال پہلے کی وہ بلی یاد آ گئی جو مسمسی صورت بنائے ہمارے صحن میں آ کر میرے قدموں میں لوٹ لوٹ کر روٹی کا ٹکڑا لے جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے باڑ کی اوٹ میں ایک چھوٹے سے گڑھے میں بچے دیئے تو میں دیکھنے چلا گیا۔ وہ غراتی ہوئی کچکچا کے مجھ پر پل پڑی۔ زخموں کے درد سے زیادہ مجھے حیرانی کھائے جاتی تھی کہ یہ وہی بلی تھی یا کوئی اور؟

"سچ بتایئے' وہ مذاق تھا یا آپ اب مذاق کر رہے ہیں"

اتنے زمانے بعد پھر مجھے اسی حیرانی کا سامنا تھا۔ یہ وہی بلی تھی یا کوئی اور؟ میں بلاوجہ اپنے جھوٹ پر اڑ گیا "وہ مذاق تھا"

"کیوں کیا مجھ سے یہ مذاق؟ تمہیں پتہ تھا کہ میری تضحیک کسی اور طرح اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے؟ مجھے پہلے دن سے معلوم تھا کہ تم ایک کمینے اور بد سرشت انسان ہو جسے دوسروں کو ایذا پہنچا کر لطف آتا ہے۔ پہلے مجھے مجبور کیا کہ میں کسی کے حرامی پلے کو اپنا بچہ بنالوں جب میں نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا تو مجھے بتا رہے ہو کہ یہ مذاق تھا۔ میری مجبوری کو کیوں میرے منہ پر دے مارا۔ کیوں؟ کیوں؟"

میں اسے کہہ رہا تھا "سنو! سنو! وہ مذاق نہیں تھا میں نے تمہیں غلط کہا۔ یہ بھی مذاق نہیں۔ تمہارے فائدے کے لئے کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی حادثہ ہو گیا۔ جو ہو سکتا ہے' تو تمہیں کس قدر شدید صدمہ ہو گا۔ تمہیں پیش از وقت ذہنی طور پر اس

کے لئے تیار کر رہا تھا۔ دیکھو خود وکیل سے پوچھ لو ٹیلیفون کر کے بچے کی بکنگ حقیقت ہے کہ نہیں"

وہ کچھ نہیں سن رہی تھی اور تکیوں مین منہ چھپائے روئے جارہی تھی۔

میں نے ٹیلیفون ملایا "مسٹر سمتھ میں جاوید احمد بول رہا ہوں بچے کا امیدوار۔ مہربانی کر کے بتایئے ہمیں ابھی اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔ تقریباً ایک ماہ اور؟ مسٹر سمتھ ذرا ٹیلیفون تھامے رکھئے میں ابھی بات کرتا ہوں۔۔۔ ثریا! مسٹر سمتھ لائن پر ہے تم خود تصدیق کر لو کہ بچے کی بکنگ درست تھی اور قائم ہے اور یہ سب مذاق نہیں تھا"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے آخر تھک کر شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹیلیفون بند کر دیا اور کرسی پر ایک مجرم کی طرح خاموش بیٹھ گیا اور شل دماغ کے ساتھ خلا میں گھورنے لگا۔ وہ اسی طرح بستر پہ پڑی سسکیاں لیتے لیتے آخر سو گئی۔

اس واقعہ کے بعد اس پر فارم پر کرنے والی رات کا موڈ منجمد ہو کے رہ گیا۔ اس نے بچہ گاڑی اٹھا کر سٹور میں ڈال دی اور اونی موزے اور ٹوپی وغیرہ جتنے بنے ہوئے تھے وہیں چھوڑ دیئے مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ ہم نے بچے کے والدین بننے کی ذمہ داری لے کر بہت بڑی حماقت کی ہے۔ زندگی کتنی پر سکون اور دھیمے لہجے میں گزر رہی تھی۔ بلاوجہ راہ چلتی مصیبت کو اپنے گھر بلا لیا اور جس کی دلجوئی کے لئے یہ سب بکھیڑا کیا تھا وہ بھی خوش نہیں۔ یہ عورت جو اتنی متلون مزاج ہے نہ معلوم اس ننھی سی جان سے کیا سلوک کرے اور پھر بچے کو پالنے کی تمام تر ذمہ داری بھی تو اسی کو نبھانا ہے جو گم سم ہو کر رہ گئی ہے خدا جانے اس کے دل میں کیا ہے؟ میرا ذہن گھوم پھر کر ہر بار یہی مشورہ دیتا تھا کہ ثریا سے بات کرنے کی ضرورت نہیں چپکے سے جا کر وکیل سے معذوری کا اظہار کر دو کہ ہم دونوں نفسیاتی طور پر بچے کو پالنے کے اہل نہیں۔ لیکن ایسا کرنے کا بھی حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ مارچ کا وسط آن لگا مجھے یقین تھا کہ کوئی دن جاتا ہے تو اطلاع آجائے گی کہ آکر اپنا بچہ وصول کرلو جلد ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ میں نے آخر ثریا سے اس موضوع پر بات چھیڑنے کی ٹھانی۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے تمہارا بچے کے بارے میں شوق کچھ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ہے

" اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو ایسے ہی ہو گا۔"

" دیکھو یہ مسئلہ بہت اہم ہے اس پر سنجیدگی سے بات چیت کرنے کی ضرورت ہے۔"

" میں بہت سنجیدہ ہوں آپ بات کریں۔"

" اگر تم اس طرح بیزاری کا اظہار کرو گی تو میں خاک بات کر سکوں گا۔"

" بیزار میں ہوں کہ تم؟ گھر آکر کبھی تو گھنٹوں مجھ سے بات نہیں کرتے اور کسی ادھیڑ بن میں خاموش بیٹھے رہتے ہو یا پھر دفعتا" یوں ترجیحی سلوک کرنے لگتے ہو جیسے میں اس گھر میں کوئی مہمان ہوں۔ ہمارے تعلقات میں جو خود اعتمادی کا ایک بھرم تھا وہ تم نے ختم کرکے رکھ دیا ہے۔"

" میں نے بھرم توڑا ہے؟ بلاوجہ تماشہ بھی میں کھڑا کرتا ہوں؟ بات بات پر پاگلوں کی طرح روتا بھی میں ہوں؟۔"

اس نے جواب دیا " اس سب کے تم ذمہ دار ہو جب سے بچہ لینے کا فیصلہ کیا ہے تمہارا رویہ بدلا ہوا ہے ہنستے بھی ہو تو یوں جیسے میری پھبتی اڑا رہے ہو۔"

" میری جان میں اتنا کمینہ نہیں جتنا تم مجھے سمجھتی ہو اب پندرہ سال کے بعد تمہاری پھبتی اڑانے کا خیال آنا تھا۔ آج کل تم جھٹ سے ناراض ہو جاتی ہو اس لئے زیادہ بات نہیں کرتا۔"

" میں نہیں جانتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمہیں کچھ ہو گیا ہے۔"

" گم سم خود رہتی ہو جیسے کوئی پچھتاوا کھائے جا رہا ہو اور ہو مجھے کچھ گیا ہے۔؟ خدارا یہ تو بتا دو تم چاہتی کیا ہو۔ اگر بچہ نہیں چاہئے تو صاف صاف کہہ دو' ہم انکار کر دیں گے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"سو مرتبہ انکار کر دو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ تم نے مجھے کون سے ایسے لعل لگا دیئے ہیں جو وہ غیروں کا بچہ آکر نہیں لگائے گا۔ میرا اپنا بچہ بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا' خاک نہیں۔ یہ تمہارا خام خیال ہے کہ میں بچے کے لئے مری جاتی ہوں یا مجھے بانجھ پن کا دکھ ہے۔ مجھے کوئی دکھ نہیں۔ جاؤ' جو تمہارے جی میں آئے کرتے رہو اور جو میرے جی میں آئے گا میں کروں گی۔ ہمارا آخر سمبندھ کیا ہے؟ یہی نا کہ ریل کے خالی ڈبے میں بیٹھے دو مسافر جو محض اتفاق سے اس میں اکٹھے ہو گئے۔"

"ہمارا سمبندھ سہولت کی شراکت ہے جو ہماری نجی اور سماجی ضرورتوں کی خاطر ظہور میں آیا۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہیں ان سہولتوں کی ضرورت نہیں رہی یا یہ شراکت بوجھ بن گئی ہے تو اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر تم یہی مناسب سمجھتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"دیکھو! ہم اپنی اپنی زندگی کے بہترین سال اکٹھے گزار چکے ہیں اور اب عمر کے ایسے حصے میں آپہنچے ہیں جہاں زندگی کے تھیلے میں ہمیں پیش کرنے کے لئے اور کچھ نہیں رہا۔ پھر ابھی ہمیں اور زندہ بھی کتنا رہنا ہے؟ کوئی دس دس پندرہ پندرہ سال۔ یہ سہولت کا کھیل ہے، اچھا یا برا جیسا بھی ہم نے کھیلا اسے اب اتنی تھوڑی سی مدت کے لئے نہ بگاڑیں تو اچھا ہے۔"

"تم بچے کے معاملہ میں میرے ساتھ لکن میٹی کا فضول کھیل کھیلنا بند کر دو۔ نہ کوئی راجہ نہ اس کی بیٹی۔ نہ مکئی نہ اس کا دانہ۔ نہ کوئی لکنا نہ چھپنا ہر کسی کو پتہ ہے کہ ہر کوئی کہاں چھپا ہے اور کھیل ہو رہا ہے اور کھی کھی خوش ہو رہے ہیں۔ یہ ساری دنیا ہی لکن میٹی کا فضول کھیل ہے اور تم مجھے پوچھتے رہتے ہو کہ تم چاہتی کیا ہو آج ذرا تم تو مجھے جواب دو تم چاہتے کیا ہو؟۔"

"مجھے تو کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

"مجھے بھی کچھ پتہ نہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر چھوڑو جھگڑا جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور جس طرح بھی ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہو رہا ہو گا، ہونے دو۔ آؤ لکن میٹی کے فضول کھیل کی طرح ہم اپنے سہولت کے رشتے کی نشانی گھڑنے کی لا حاصل کوشش پھر کریں۔"

یہ سن کر ایک تھکن آلود پھیکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر کے بجھ گئی اور اس نے یونہی الجھن کا اظہار کرنے کے لئے گردن جھٹک کر، چہرہ دوسری طرف گھما کر ٹھوڑی کندھے پر رکھ لی۔

وکیل کی اطلاع کے مطابق ہم تیس مارچ کو زچگی ہسپتال کے استقبالیہ میں صبح دس بجے پہنچ گئے۔ وہاں مسٹر سمتھ موجود تھا۔ اس نے ہم سے ہاتھ ملایا اور کونے میں پڑی پلنگڑی کی طرف اشارہ کیا "آپ کا شہریار۔"

ثریا نے کہا "ہم لے لیں؟۔"

"اوہ! یقیناً" یقیناً"۔"

ثریا فوراً جا کر بچے کو اٹھانے میں لگ گئی۔ مسٹر سمتھ نے مبارک باد کہی اور پھر ثریا کی طرف دیکھ کر مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا "وہ تو یک دم اپنے فرائض مادری میں بہت مصروف ہو گئی ہیں آپ یہ بچے کی ولایت کے کاغذات سنبھال لیجئے مجھے اجازت خدا حافظ!"

ثریا سفید گٹھڑی کو گود میں اٹھائے کھڑی غور سے اسے دیکھ رہی تھی اور میں کاغذات پر نظر ڈال رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا "آپ وہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ آکے ذرا دیکھیں تو کتنا خوبصورت ہے ..... ہمارا بیٹا" میں نے پشت کی جانب سے جا کر اسے سینے سے لگا لیا کیونکہ اس وقت اسے اس سہارے کی اشد ضرورت تھی اور اس کے کندھے کے اوپر سے نیچے جھانک کر گٹھری میں دیکھا' وہاں تو واقعی بچہ تھا۔ زندہ اور انسانی' اس وقت مجھ پر پہلی دفعہ واضح ہوا کہ بچے کو یوں ایک ٹھوس حقیقت کی طرح سامنے دیکھنے اور اس کے بارے میں محض سوچتے رہنے میں کتنا عظیم فرق ہے۔ گنجان سیاہ بال سفید رنگ' بند آنکھوں کے پپوٹے اور چہرہ قدرے سوجا ہوا۔ میں یوں حیران تھا جیسے کوئی معجزہ میری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہو رہا ہو۔ ثریا نے گردن گھما کر میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے تھپتھپاتے ہوئے کہا "بہت خوبصورت ہے.... ہمارا بیٹا' آؤ اب گھر چلیں۔ لاؤ اسے مجھے دے دو۔"

"نہیں۔ میں خود لے کر جاؤں گی۔"

"تم کانپ رہی ہو کہیں گرا نہ دو۔"

"نہیں! آپ ہم دونوں کو اس طرح سہارا دے کر لئے چلیں' دنیا کے آخر تک"

ہم کار کی جانب خاموش چلے جا رہے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنے جذبات کا ابال نکالنے کے لئے بولے جانا چاہتی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا باتیں کرے۔ اس کا ذہن بیک وقت کئی جانب سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ جب خیالات میں الجھ کر کچھ نہ سوجھتا تو مجھے پر اور زیادہ گر پڑتی کہنے لگی "اب میں نوکری کیسے کر سکوں گی؟ شہریار کو تو ہر وقت میری ضرورت ہو گی

" ہوں ' چھوڑ دینا ۔"

" اب ہم شام کو کہیں باہر نہیں جایا کریں گے ۔ آپ بھی نہیں جائیں گے ۔ باہر جانے سے خرچ بہت ہوتا ہے اور ہمیں ایک ایک پیسے کی ضرورت ہو گی ۔ میری تنخواہ بھی بند ہو جائے گی ۔ ہمارے پاس کچھ اثاثہ بھی تو جمع ہونا چاہئے ۔ اگر آپ شامیں بھی باہر گزاریں گے تو ہمارے پاس کب بیٹھا کریں گے دن بھر تو آپ کام پر ہوں گے ۔" پھر جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ۔ " ہاں ! میں تو زچگی میں ہوں ۔ آپ ابھی پاکستان سب کو تاریں دے دیں کہ ہمارے ہاں بیٹا ہوا ہے اور ہم نے اس کا نام شہریار رکھا ہے بلکہ لکھیں کہ شہریار جاوید احمد شیخ رکھا ہے اور بہت ہی پیارا پیارا ہے ۔"

میں مسکرا پڑا اور مذاقاً کہا " اتنا لمبا نام رکھنا ہے تو بیچ میں کہیں ثریا بھی ٹانک دیں ۔"

سنجیدگی سے کہنے لگی " نہیں نہیں : اولاد اور بیوی کے نام میں باپ اور شوہر کا نام ہی شامل کیا جاتا ہے ۔ وہی دونوں کا محافظ ہوتا ہے نا ! ماں کا نام بھلا کون شامل کرتا ہے ؟"

میں نے اسے اور بھینچ کر سینے سے لگا لیا اور بغل میں کاغذات درست کرتے ہوئے ایک ہاتھ گٹھڑی کے گرداگرد رکھ دیا کہ کہیں کھلونا گر نہ جائے ۔

(۲)

ایک شام گھر آیا ثریا نے دروازہ کھولا ' بے حد پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی " شکر ہے آپ آگئے ۔ آج تو ایک عجیب واقعہ ہونے والا تھا ۔"

" کیا ؟ ۔"

" آپ ادھر باورچی خانے میں آجائیں ۔"

" شہریار کہاں ہے ؟ ۔"

" وہ ٹی وی دیکھ رہا ہے ۔"

میں باورچی خانے میں چلا گیا اس نے دروازہ بند کر لیا ۔

" کیا ہوا کچھ بولو بھی ۔"

" آج ایک عورت شہریار اور فرینک کو اغوا کرنے لگی تھی ۔"

" عورت اغوا کرنے لگی تھی ؟ شہریار اور فرینک کو ۔ کیوں ؟ کہاں ؟ "

"پہلے تو جب یہ سکول جا رہے تھے راستے میں ان کے ساتھ ہو گئی اور سکول تک ان کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی گئی ۔ چھٹی ہوئی تو پھر مل گئی اور کہنے لگی ' میرے ساتھ کار میں چلو ' تمہیں بہت سے کھلونے لے دوں گی ۔ چاکلیٹ اور آئس کریم کھلاؤں گی اور پھر آدھ گھنٹے کے اندر اندر تمہیں واپس گھر چھوڑ دوں گی۔ آج کل اغوا کی اتنی وارداتیں ہو رہی ہیں ۔ میرا تو دل لرز رہا ہے۔ آپ فرینک کے باپ کو ساتھ لے جا کر ابھی پولیس میں رپورٹ درج کرا دیں ۔"

" شہریار سے تو ذرا پوچھ لوں کہ کیا واقعہ ہوا ہے ۔"

"نہیں ۔ اس سے نہ پوچھیں ۔ جب بھی یہ بات ہوتی ہے تو اس کی ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں ۔ بار بار اسے خوفزدہ نہ کرنا چاہیۓ ۔"

" بھئی ! پولیس کو رپورٹ کریں گے تو وہ بھی اسی سے پوچھ گچھ کرے گی ۔ اچھا ! فرینک اور اس کے والدین مسٹر اور مسز ڈگلس کو بلوا لیتے ہیں ۔ اب تک کھانا کھا چکے ہوں گے ۔ پھر باہم مشورہ سے کوئی قدم اٹھائیں گے ۔ تم بلاوجہ گھبراؤ مت ۔ کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔"

ڈگلس کی رہائش ملحقہ فلیٹ میں تھی شہریار جا کے انھیں بلا لایا۔ میں نے فرینک کے والدین سے کہا " آج ہمارے بیٹے زندگی میں پہلی مرتبہ حقیقی سنسنی خیز حالات سے دو چار ہوئے ہیں ۔"

مسٹر ڈگلس نے کہا " ہاں کسی حد تک ۔"

میں نے کہا " ہم کہاں کے امیر ہیں جو کوئی یرغمال کے لالچ میں ہمارے بچوں کو اغوا کرے گا ۔ میرا خیال ہے کوئی تنہا روح ہو گی ' شاید نشہ میں دھت ۔ بچے پیارے لگے ہوں گے تو تنہائی دور کرنے کے لئے یونہی تھوڑی دیر ان کو ساتھ لے کر گھومنا چاہتی ہو گی ۔ باقی ان کی ماؤں کے زرخیز تصورات نے اسے لرزہ براندام داستان میں تبدیل کر دیا ۔"

مسز ڈگلس صوفے میں خوب ٹھسے سے جمی دھڑا دھڑ سوئٹر بننے میں محو تھی بولی " اوہ ! شٹ اپ مسٹر شیخ ! معاملہ اتنا ہلکا پھلکا نہیں جتنا تم سمجھتے ہو ۔"

صوفے کے بیچ پر ثریا بدستور دہشت زدہ چہرہ لئے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ لگ کر شہریار بیٹھا تھا اور پھر فرینک (ان کے چہرے پر کوئی ہوائیاں نہیں اڑ رہی تھیں۔ یہ ایسے جھوٹ کیوں بولا کرتی ہے) دونوں بچے ایک دوسرے کے کانوں میں منہ دیئے باتیں کرتے جا رہے تھے اور ٹھس ٹھس ہنستے جا رہے تھے۔ میں نے مسز ڈگلس سے کہا "پھر نئی آمد متوقع ہے جس کے لئے اتنی تیزی سے اونی کپڑے تیار ہو رہے ہیں۔"

مسٹر ڈگلس مسکرا پڑا اور مسز ڈگلس ہنستے ہوئے کہنے لگی "خدا کے لئے اب نہیں بہت ہو چکی۔"

میں نے فرینک سے کہا "چلو فرینک! ذرا مجھے بھی بتاؤ، آج کیا ہوا تھا۔"

"انکل! ہم دونوں فٹ پاتھ پر انگلیوں سے دھاگے کی شکلیں بنانے کا کھیل کھیلتے سکول جا رہے تھے کہ ایک عورت جو ہندوستانی تھی ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگی اور مجھے کہنے لگی۔ بچے تمہارا نام کیا ہے؟ میں نے کہا میرا نام فرینک ڈگلس ہے۔ پھر یارک کو کہنے لگی تمہارا نام میں جانتی ہوں، شہریار ہے ٹھیک ہے نا...." فرینک آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر اور ہاتھ چلا چلا کر بہت تیزی سے اپنی بات کی رو میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

مجھے شروع سے ہی شک تھا کہ یہ عورت کوئی اغوا کرنے والی نہیں، ہو نہ ہو یہ شہریار کی حقیقی ماں ہے جو پھر کسی وجہ سے گڑے مردے اکھاڑنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ جونہی فرینک نے لفظ ہندوستانی منہ سے نکالا تو میرا شک یقین کی حد تک پہنچ گیا کہ یہ وہی عورت ہے اور جتنا مجھے اندازہ تھا اس سے کہیں زیادہ کمینی۔ میں نے فرینک سے کہا "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ہندوستانی تھی۔"

"اس نے آنٹی کی طرح ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور یارک کا نام شہریار اسی لب و لہجہ میں کہتی تھی جیسے آپ اور آنٹی کہتے ہیں۔"

ثریا جھنجلا کر بولی "اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے یا پاکستانی یا یورپین۔ جرائم پیشہ لوگ کسی خاص قوم سے متعلق تو نہیں ہوتے ہمیں پولیس میں رپورٹ درج کرا کے اسے گرفتار کرا دینا چاہئے۔ اس کے علاوہ اس عورت سے جان چھڑانے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔"

میں نے دل میں کہا " اچھا تو تمہیں بھی یقین ہے کہ شہریار کی ماں اسے راستے میں ملی تھی مگر تم نے مجھ سے کیوں چھپایا ؟" بات مجھ پر بالکل واضح ہو گئی تھی اور فرینک جس تفصیل سے یہ بتاتا چلا جا رہا تھا ۔ اس سے خطرہ تھا کہ کہیں ڈگلسز کو شک نہ ہو جائے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے ۔ اس لئے میں نے کہنا شروع کیا ۔ "مسٹر ڈگلس ! قصہ وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں ۔ فی الحال پولیس کو رپورٹ کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ۔ کیا خیال ہے تمہارا ؟ ۔"

" میں تم سے متفق ہوں ۔"

ثریا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے دلاسہ دے کر خاموش کرا دیا ۔ دونوں لڑکوں کو تنبیہہ کر دی کہ کسی کے ساتھ ہرگز کہیں مت جائیں البتہ وہی عورت پھر جب بھی ملے تو ہمیں بتائیں ۔

ثریا ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے اداس بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی ۔ میں بظاہر اخبار کے ورق الٹ پلٹ رہا تھا لیکن ذہن حالیہ واقعات کے دور رس اثرات کے بارے میں تخمینے لگانے میں مصروف تھا ۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ شہریار بالکل بے سدھ سو گیا ہے تو میں نے کہا " وہ آگئی ، جسے کبھی نہ آنا چاہئے تھا ۔"

" ہاں ! وہ آخر آ ہی گئی ۔ میں نے جب پہلی مرتبہ شہریار کو اٹھا کر سینے سے لگایا تھا تو اس عورت کی پرچھائیں میرے دل پر گہرا سایہ ڈالتی ہوئی گزر گئی تھی ۔ اس کے بعد سے اس پرچھائیں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا ۔ وقفے ، وقفے سے لوٹ لوٹ کر آتی رہی ہے ۔ آؤ ! دوسرے کمرے میں چلیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ راز جس کو اس سے چھپانے کے لئے اتنے جتن کر رہے ہیں یوں ہماری بے احتیاطی سے اس پر ظاہر ہو جائے " ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے ۔

ثریا نے پوچھا " اب کیا ہو گا ؟ ۔"

" کچھ نہیں ہو گا ۔ وہ ہم سے شہریار کو لے تو نہیں سکتی ۔"

" مجھے پتہ ہے کہ وہ شہریار کو ہم سے لے تو نہیں سکتی مگر اتنی بات اس سے کہہ کر کہ یہ تمہارے والدین نہیں ہیں تمہاری حقیقی ماں میں ہوں ، ہمارا اچھا بھلا کھیل تو بگاڑ سکتی ہے شہریار ہمارے بارے میں کیا سوچے گا ؟ وہ جسمانی طور پر ہم سے دور تو نہ ہو گا لیکن ذہنی طور پر تو ہو جائے گا ۔ کاش ! جہاں مسز ڈگلس اتنے بچے جننے سے تھکی

ہوئی ہیں وہاں یہی ایک بچہ میرے اپنے اندر سے ہوتا۔"

"بے وقوف عورت اس سے کیا فرق پڑتا؟ ہم اگر اپنے والدین کی حقیقی اولاد نہ ہوتے تو کیا ان کے لئے یا ہمارے لئے موجودہ حالات مختلف ہوتے؟ ایک زمانے سے وہ کہاں ہیں اور ہم کہاں؟ صرف ایک دوسرے کا پتہ معلوم ہے جو عملی طور پر بالکل بیکار ہے۔ اب ہم میں اور ان میں کیا مشترک رہ گیا ہے؟ کچھ نہیں۔ ان میں سے دو تو ویسے ہی مر گئے۔ جو زندہ ہیں ان سے ملے ہوئے بھی برسوں ہو گئے۔ اور اگر اب ملیں بھی تو کوئی فائدہ نہیں ملنے کا کیونکہ کوئی بات ہی کرنے کے لئے نہیں ہو گی اب شہریار کی حقیقی ماں سڑکوں پر پھر رہی ہے اور شہریار بچے کا کھیل ہمارے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اس عورت نے جو اپنا کھیل رچایا تھا اس میں شہریار اپنی باری دے کر اس کھیل میں شامل ہو گیا ہے۔ بچوں اور والدین کا کھیل ایسے ہی کھیلا جاتا ہے جیسے ہم کھیل رہے ہیں صرف بیچ میں اب اس کی ماں روند مارنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن اس کو ٹھیک کرنے کے بہت سے طریقے ہیں مثلاً ہم یہ ملک چھوڑ کر کسی اور دیس جا آباد ہوں گے جہاں کی خبر اس کے فرشتوں کو بھی نہ ہو سکے گی۔ اتنی بڑی دنیا میں کیا ہمیں ایک کونہ بھی نہ مل سکے گا جو ہمیں اس کی نظروں سے چھپالے؟۔"

"ملک ایک لمحے میں تو نہیں بدلا جا سکتا' اس کے لئے کچھ وقت چاہئے' کم از کم چند مہینے اور اسے تو تمام کھیل تلپٹ کرنے کے لئے شہریار سے صرف ایک بات کہنی ہے جو ایک لمحے سے بھی کم وقفے میں کہی جا سکتی ہے اسے تم فوراً گرفتار کرا دو اس کے علاوہ اور کسی طریقے سے اسے نہیں روکا جا سکتا۔"

"ثریا! جب لڑکوں نے تمہیں راہ میں ایک عورت کے ملنے کی بات بتائی معلوم ہوتا ہے تمہیں اسی وقت یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہی عورت ہے۔"

"ہاں۔"

"پھر مجھے بتاتے وقت تم یہ کیوں چھپا گئی تھیں۔"

وہ مجھے یوں حیرانی سے دیکھ رہی تھی جیسے "دشمن جھاڑی سے اٹھ کر دفعتاً" اس پر حملہ آور ہو گیا ہو "یقین نہیں شک تھا۔"

"شک کا بھی اظہار کیوں نہ کیا؟۔"

"تم تو مجھے اس طرح دبا رہے ہو جیسے میں شہریار کی اصلی ماں ہوں اور تم پولیس

والے ہو۔"

" یہ بات نہیں ۔ لیکن تم دھوکے میں رکھ کر وہ کرانا چاہتی تھیں ۔ جو تم جانتی تھیں کہ اصل واقعات سے واقف ہوتے ہوئے میں کرنے سے انکار کردوں گا ۔"

" مثلاً کیا ؟۔"

" پولیس کو رپورٹ ۔"

" تو میں کیا غلط چاہتی تھی ۔ سن لو ! اگر اس کو گرفتار نہ کرایا ......۔"

" تم بھی سن لو ! اس کو اگر گرفتار کرا دیا تو وہ راز جو آج تک ہمارے سینوں میں چھپا ہوا ہے اچھل کر کوٹھے پر چڑھ جائے گا ۔ اخبارات قصہ لے اڑیں گے ۔ پاکستان میں سب کو پتہ چلے گا کہ ہم نے ان سے کتنا بڑا دھوکا کیا ۔ یہاں سب جاننے والے دانتوں میں انگلیاں دبا کر ہنسیں گے ۔ شہریار یکدم ننگا محسوس کرے گا ۔ ڈگلسز حیران ہوں گے ۔ فرینک افسوس کرے گا کہ ہم یارک کے اصلی والدین نہیں ہیں ۔ کیا کچھ نہیں ہو گا ۔"

" مجھے تو صرف شہریار کا مکمل اعتماد بطور ماں کے درکار ہے ۔ اب اگر وہ عورت شہریار کے کان میں بتا دیتی ہے کہ میں اس کی ماں نہیں یا بات چار دانگ عالم میں نشر ہو کر اس تک پہنچتی ہے ۔ میرے لئے دونوں برابر ہیں ۔"

"میں کہتا ہوں کہ اگر اسے پوری بات معلوم بھی ہو جائے تو کیا فرق پڑتا ہے تین انسانوں سے متعلقہ راز پہلے صرف دو کو معلوم تھا ۔ اب تیسرے کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ ہم تینوں کے تعلقات میں ایک نئی بعد پیدا ہو جائے گی ایک نئی جہت ابھر آئے گی۔ ہم تینوں کے درمیان ......۔"

خدا کے لئے اس وقت مجھ سے یہ کتابی باتیں مت کرو ۔"

ہم دونوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے فضا میں تکتے رہے ۔ یوں لگتا تھا جیسے دو اکائیاں الگ الگ اور قطعی تنہا ہر ضرورت سے مبرا ازل سے یونہی بیٹھی ہیں اور ابد تک یونہیں بیٹھی رہیں گی اور ایک رشتہ درد کا دونوں میں سانجھا تھا ۔

میں نے بات کی تو خاموشی ٹوٹ کر یوں گری جیسے کوئی خشک اور خستہ ٹہنی ہو ۔" ثریا ! میرا خیال ہے وہ کرید کی وجہ سے اسے دیکھنے چلی آئی اور کوئی خاص بات نہیں مجھے یقین ہے وہ چند دنوں میں وطن اپنے اس خاندان کے پاس واپس لوٹ جانے پر

مجبور ہو گی جس خاندان کی خاطر شہریار کو ہمارے سپرد کرنے پر مجبور تھی۔ تم کل سے شہریار کو بیماری کے بہانے سکول مت جانے دو۔"

"لیکن ہم فوری طور پر یہ مکان چھوڑ دیں۔ اس کا اسے پتہ چل گیا ہے۔"

"فارم میں مندرجہ مکان کو چھوڑے اور اس میں منتقل ہوئے ہمیں پانچ سال ہو گئے ہیں۔ وہ جس نے یہ مکان ڈھونڈ لیا وہ دوسرا بھی ڈھونڈ لے گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس میں اسے کچھ وقت تو لگے گا۔ کیا خبر اتنے میں اسے واپس ہی جانا پڑ جائے اور اس کے دوبارہ آنے تک ہم یہ ملک چھوڑ چکے ہوں گے یوں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی کہ ہم کہاں ہیں اور ہم تینوں یوں گم ہو جائیں گے کہ کہیں نشان نہ مل سکے گا۔"

دوسرے دن ترک ملک کا طریق کار دریافت کرنے کے لئے اور تلاش مکان کی خاطر میں نے دفتر سے چھٹی لے لی صبح شہریار سکول جانے کی تیاری کرنے لگا تو ثریا نے کہا "آج سے تم سکول نہیں جاؤ گے۔"

"کیوں ؟۔"

"میں اور تمہارے پاپا نہیں چاہتے۔"

"ممی ! آپ کیوں نہیں چاہتے۔ وہ عورت مجھے اٹھا کر لے جائے گی' اس لئے ؟ پاپا ! فرینک بھی سکول نہیں جائے گا ؟۔"

ثریا نے کہا "ہمیں نہیں پتہ مگر تم نہیں جاؤ گے۔"

اتنے میں فرینک گلے میں بستہ ڈالے پہنچ گیا "یارک ! ابھی تم تیار نہیں ہوئے؟"

"ممی نہیں چاہتی کہ میں سکول جاؤں۔"

اپنی سوالیہ نظروں کا جواب پانے کے لئے فرینک کی آنکھیں ثریا کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ "ہاں ! فرینک آج اس کی طبیعت اچھی نہیں۔"

"ممی میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔"

"تمہیں ہلکا ہلکا بخار ہو رہا ہے' سکول جانے سے زیادہ ہونے کا احتمال ہے۔"

"آنٹی آپ ڈرتی ہیں کہ یارک اگر سکول گیا تو وہ عورت اسے اغوا کر کے لے جائے گی اور پھر اسے گھورے میں چھپا کر ریغمال کے لئے خط لکھے گی۔" شہریار کو

مخاطب کر کے کہنے لگا۔" یارک! تو کتنا اہم بن جائے گا لیکن میں تو نہیں ڈرتا۔یارک! تو کیا روئے گا؟۔"

شہریار گویا للچا اٹھا" ممی مجھے بخار نہیں ہے پلیز فرینک کے ساتھ سکول جانے دیں۔"

یو شٹ اپ۔ خواہ مخواہ بکواس کئے جاتا ہے۔"

فرینک ماحول میں تیزی پیدا ہوتے دیکھ کر خاموشی سے کھسک گیا۔

"پاپا! وہ عورت فرینک کو اغوا نہیں کرے گی؟۔"

" بیٹے میں اس کا جواب کیسے دے سکتا ہوں۔"

" مجھے اغوا کر لے گی؟۔"

" پھر وہی بات۔ میں بھلا کیوں کر بتا سکتا ہوں۔"

" آپ اسی لئے مجھے سکول نہیں جانے دیتے۔ وہ صرف مجھی کو اغوا کرنا چاہتی ہے۔"

ثریا نے جھک کر اسے سینے سے لگا لیا اور سر پر بوسہ دیا۔" میرے بیٹے تم ڈرو نہیں۔ تمہیں کوئی اغوا نہیں کر سکتا۔"

" ممی! وہ مجھے کیوں اغوا کرنا چاہتی ہے؟ آپ اسے پہلے ہی یرغمال کی رقم دے دیں۔"

" وہ مانگے تو میں اپنی جان بھی دے دوں۔" ثریا کی آواز بھرا گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ رو دیتی، میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کہا۔

فرینک کی باتوں سے جو پہلے شہریار میں طفلانہ ولولہ سا پیدا ہوا تھا وہ اب خوف کے نیچے کہیں بہت دور دب گیا تھا۔

مسز ڈگلس اندر آگئی" فرینک نے بتایا ہے کہ آپ اغوا کے ڈر سے آج یارک کو سکول نہیں بھیج رہے اور مسٹر شیخ آپ بھی شاید اسی لئے کام پر نہیں گئے۔ رات تو آپ اس قدر دہشت زدہ نہیں تھے اور فیصلہ کیا تھا کہ لڑکے سکول جائیں گے اور اسی لئے میں نے فرینک کو جانے بھی دیا۔"

" مسز ڈگلس آپ نے ٹھیک کیا۔ فرینک کو کوئی خطرہ نہیں۔ ہم نے غور کیا ہے

وہ عورت صرف یارک کو اغوا کرنا چاہتی ہے۔ لڑکوں نے جو کہانی بتائی تھی اس سے آپ نے بھی یہی اندازہ لگایا ہو گا۔ آپ تو ویسے ہندوستان میں کافی عرصہ رہ چکی ہیں ہم لوگوں کا مزاج سمجھتی ہیں۔ بات یوں ہے کہ پیچھے ہمارے وطن پاکستان مین ہمارے خاندان کی کچھ اور خاندانوں سے صدیون پرانی دشمنیاں چلی آ رہی ہیں اور ہمیں شک ہے کہ یہ عورت اس سلسلہ کی ایک کڑی کے طور پر یارک کو اغوا کرنا چاہتی ہے۔"

"لیکن یہ پاکستان نہیں۔ اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ اس طرح خوف و ہراس پھیلا کر لوگوں کی زندگی اجیرن کر دے آپ فوراً پولیس کو اطلاع کیوں نہیں کرتے؟۔"

"مسز ڈگلس نئے ملک میں آجانے سے اصل تو نہیں بدل جاتی۔ اس میں کچھ نسلیں صرف ہوتی ہیں۔ پولیس کو بھی مطلع کریں گے مگر پہلے یہ سوچ رہے ہیں کہ اس کا رد عمل یہاں اور پاکستان میں کیا ہو گا۔ بہر طور ہم خوفزدہ نہیں ہیں لیکن احتیاط لازم ہے۔"

میں اپنے پروگرام کے مطابق نیا مکان لینے اور تبدیلی ملک کے لئے کینیڈین ہائی کمیشن میں درخواست دینے کے لئے فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے بازار میں پہنچا تو سامنے وہ عورت کھڑی تھی۔ شہریار کے چمکتے ہوئے ماتھے پر چند گہری گہری لکیریں پڑ گئی ہیں۔ البتہ شہریار کی مائع، معصوم، بوجھل آنکھوں کی بجائے تجربے کی ذہانت لئے ہوئے مدبر آنکھیں مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔

"ہیلو"

"ہیلو" میں نے جواباً کہا

"مسٹر جاوید شیخ؟ میں ...."

"آپ شہریار کی ماں ہیں، میں پہچان گیا ہوں۔"

"ایک شہریار کی ماں اور دوسرے شہریار کی ...."

"محبوبہ۔"

ایک ثانیے کے لئے اس نے نظریں چرا کر دوسری طرف پھیرلیں۔ "اب شہریار کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے پوچھا "بہتر ہے۔"

مجھے افسوس ہے کہ میں ایک بھوت کی طرح آپ کی زندگی پر اپنے آپ کو مسلط

کر رہی ہوں ۔ میں دراصل ہوں ہی ایک بھوت ۔ آئیے کہیں بات کریں ۔"

"چلئے ۔"

ہم ایک ریسٹوراں میں داخل ہو گئے ۔ وہ خالی میزوں کے درمیان میرے آگے آگے چلتی ہوئی آخر میں ایک کونے کی میز پر پہنچ کر رک گئی "یہ گوشہ شاید ہمیں مطلوبہ سکون مہیا کر سکے ۔"

اگر میرے اعصاب پر یہ بوجھ نہ ہوتا کہ مجھے ابھی اس کے ساتھ ایک فیصلہ کن یدھ کرنا ہے تو اس کے بالوں میں چند سفید خطوط دوڑنے کے باوجود بہ آسانی اس پر عاشق ہو کر محبت میں رچے بسے فقرے بول سکتا تھا ۔ وہ آخر اس بچے کی ماں تھی جو اب میرا بیٹا تھا میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "آپ چاہتی کیا ہیں ؟ ۔"

" خدارا اس طرح کے دو ٹوک سوال نہ کریں ۔ آئیے ہم باتیں کریں بہت سی باتیں ۔ ان کے دوران ممکن ہے کہیں یہ بھی نکھر کے سامنے آجائے کہ میں کیا چاہتی ہوں ۔ ویسے میں ابھی تک کچھ نہیں جانتی کہ کیا چاہتی ہوں ۔ ہمیشہ سے میرے چاروں طرف گہری دھند ہے اور میں سدا سے ایک گم شدہ روح کی طرح بھٹکتی رہی ہوں ۔ شہریار سے محبت نے ایک وقفہ کوئی سال ڈیڑھ سال کے لئے ایسا مہیا کیا تھا کہ مجھے دھند چھٹتی ہوئی معلوم پڑی تھی اور زندگی میں ایک موہوم سا مقصد صورت پذیر ہوتا نظر آتا تھا مگر شہریار کی ولادت سے کچھ عرصہ پہلے اس کا سرا بھی ہاتھ سے پھسل گیا اور میں پھر مکمل طور پر دھند کی لپیٹ میں تھی ممکن ہے اس کی وجہ صدیوں پرانے اخلاقی ضابطے کی خلاف ورزی پر ہمارے ضمیروں کی ناراضگی ہو جو طاقتور دیوتاؤں کی طرح اس بغاوت کی تاب نہ لاتے ہوئے بدلہ لینے کے جنون میں پاگل ہو اٹھے تھے ۔ مگر نہیں ۔۔ ہم ویسے ہی ایک دوسرے سے تھک کر گر گئے تھے ۔ جذبات چاہے محبت کے ہی کیوں نہ ہوں ان کی ایک حد ہوتی ہے ۔ ویسے بھی ہمارے پاس وقت کم تھا اور انھیں پوری عمر پر پھیلانے کی ڈھیل نہ دے سکتے تھے ہم نے ان منہ زور گھوڑوں کو چابک پر چابک مار مار کے نہایت تیز بھگایا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جلد ہی تھک گر گئے ۔ شاید آپ سمجھتے ہوں کہ میں کوئی جنسی مہم جو ہوں ' یا عشق باز عورت ہوں نہیں ' ایسا نہیں ہے ۔ شہریار سے میری پہلی اور آخری محبت تھی جو جلد ختم ہو گئی

جیسا کہ آپ کو شاید یاد ہو۔ میں اس وقت تین بچوں کی ماں تھی اور وہ تین بچوں کا باپ تھا میں اٹھارہ انیس برس کی تھی جب میری شادی ایک ایسے ذہین اور روبہ ترقی وکیل سے کر دی گئی جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی اور جو ایک غریب اور سماجی لحاظ سے بہت پسماندہ خاندان سے ابھرا تھا وہ ایک نوٹ چھاپنے والی اچھی مشین تھا بلکہ ہے۔ میں اس سے کبھی محبت نہ کر سکی اور اس کے پیشہ ورانہ طور پر اس قدر کامیاب ہونے کے باوجود شاید میرے دل میں اس کا احترام بھی نہیں مجھے ہمیشہ سے اس کی پوری شخصیت سرسوں کے تیل میں ڈوبی ہوئی معلوم دی اور مجھے وہ بو حد درجہ ناپسند رہی ہے وہ قریب ہو تو نہ جانے کیوں میرے نتھنوں میں سرسوں کے تیل کے بخارات گھسنے شروع ہو جاتے ہیں جو ایک عجیب انداز میں مجھے اندھیری 'بو سے بھری' تنگ جگہوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ بچپن سے میرے دو بڑے بھائی میرے ہیرو تھے۔ وہ لمبے تڑنگے ' خوش پوش اور مغربی آداب نشست و برخاست پر پوری طرح عمل پیرا اور ایک ایک بال سلیقہ سے جما کر رکھنے والے لوگ ہیں اور میرا خاوندان کی تقریباً ضد ہے اسے بھی غالباً مجھ سے محبت نہیں میں اس کے نزدیک بے شمار شوخ رنگوں والے آسٹریلین طوطے کی حیثیت رکھتی ہوں۔ خوبصورت اور نادر۔ مجھے ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ میرا حسن اپنی دلفریبی اور جاذبیت کے لحاظ سے وسیع تر حلقہ اقتدار اور پرشور داد و تحسین کا حقدار تھا اس کی انا کی تسکین ایک زندگی کی ہر خوبصورتی سے اندھا غیر رومانی اور انتہائی عملی نقطہ نظر رکھنے والا شخص کیا کر سکتا تھا اس تک اپنے آپ کو محدود رکھنا مجھے اپنے اوپر ایک ظلم محسوس ہوتا تھا اس کے باوجود ہم معاشرے کے مروجہ اصولوں کے مطابق زندگی گزارتے رہے ہیں ماسوائے اس مختصر وقفہ کے جب میں شہریار کی محبت میں غرق تھی لیکن خوش قسمتی سے اس کا بھی کوئی خاص چرچا نہیں ہوا شہریار آداب مجلسی اور رکھ رکھاؤ میں ہی نہیں شکل و صورت میں بھی میرے بھائیوں سے مشابہ تھا۔ ابتدا میں یہی وجہ مجھے اس کے قریب لے جانے کی تھی ویسے تو میں اور بہت سے لوگوں سے ملی ہوں گی جن کے خصائل میرے بھائیوں جیسے ہوں گے مگر اس کی سیاہ مائع آنکھیں بالکل شہریار جیسی ' خواب میں بھی مجھ سے اپنی خاموشی کی آواز میں زندہ رہنے کا سلیقہ مانگ رہی ہوتیں۔ زندگی کچھ یوں ہو گئی جیسے کسی ' اٹھارہ سالہ لڑکی پر کوئی رومان بھرا ناول بیت رہا ہو میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ

پرانے پڑھے ہوئے ناولوں کا عمل تھا جو اتنی دیر بعد تاثیر لایا یا محبت کی وجہ سے صورت حال ناولوں سے مشابہہ نظر آنے لگی آخر وہی ہو کر رہا جو ان ناولوں میں ہو کر رہتا ہے یعنی میں اس کی جھولی میں گر کر بکھر گئی۔ تھوڑے دن گزرے تو وہ ایک وظیفہ پر یہاں انجینئرنگ کے کورس کے لئے بھیج دیا گیا جہاں پہلے اس کی آنکھیں مجھ سے میری طلبگار تھیں وہاں اب میں ان آنکھوں کے ہجر میں دیوانی ہو اٹھی مجھے بچوں تک کا ہوش نہ رہا دل تو بہت چاہتا تھا کہ ایک نعرہ مستانہ لگاؤں اور اس کے پاس پہنچ جاؤں چونکہ عورت تھی اس لئے ڈرتی تھی کہ اگر گھر سے نکال دی گئی تو کہاں جاؤں گی خاموش رہی اور کمزور کا ازلی حربہ مکر بروئے کار لائی اور گرمیوں کی چھٹیوں میں سیر کے بہانے میاں کو ساتھ لے کر یہاں آ دھمکی۔ میں نے ضد کر کے ایک بیوٹی سکول میں داخلہ لے لیا سال بھر کا کورس تھا ملکیت کے پنجرے میں بند رہنے والا خوبصورت اور نادر طوطا اگر کوئی فرمائش کرے تو مان لینی چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ افسردگی کے مارے اس کے شوخ رنگوں والے پر ایک ایک کر کے ہوا میں اڑ جائیں اور وہ گوشت کی بوٹی سا پنجرے میں انکارہ جائے تو کس کام کا ہو گا" یہ کہہ کر وہ ہنسی ' داستان گوئی کے سحر سے چونکی ' میرے تاثرات بھانپے اور چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا "آپ کو زیادہ دیر تو نہیں ہو رہی ؟۔"

میں سوچ رہا تھا کہ ایک عام سی روئیداد ہے لیکن ہر کہانی ایک ہی کہانی ہوتی ہے کسی گناہ یا بغاوت کی کہانی (دونوں الفاظ ہم معنی ہیں) مگر ہر بار اچھی لگتی ہے اور پھر جب تتلی کے پروں جیسے ہونٹ ' آپ بیتی سنا رہے ہوں ' اور تیزی سے اپنا اندر باہر لانے کی کوشش میں مست شرابیوں کی طرح لغزش پر لغزش کھا رہے ہوں تو اثر دو بالا ہو جاتا ہے۔ میں اس کی بات سننے سے کم اور اس کا چہرہ پڑھنے سے زیادہ سمجھ رہا تھا یہ عورت اگر میری بیوی ہوتی تو ہم دونوں شاید جذباتی سطح پر زیادہ ہم آہنگی کی زندگی بسر کر سکتے تھے مگر نہیں۔ ہم تھوڑے عرصہ مین الگ الگ راہوں پر چل نکلتے۔ جب میری ماں میرے لئے بیوی تلاش کر رہی تھی اس زمانے میں یہ خدا معلوم کہاں اور کن ہواؤں میں ہو گی اس پکڑ دھکڑ میں اگر کہیں یہ قابو آجاتی تو پتہ نہیں کیا گزرتی ' ایک بچہ تو یقیناً" دیتی۔

وہ کہہ رہی تھی "شہریار سے مل کر علم ہوا کہ وہ بھی جدائی میں تڑپ رہا تھا۔

اس کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے پہلی بار اپنے مکمل ہونے کا احساس ہوا۔ اس کا جنس سے کوئی تعلق نہیں شاید ہو بھی۔ خیر جیسے بھی ہوا میں آج بھی خوش ہوں کہ مجھے ایک بار تو یہ احساس نصیب ہو سکا۔ بہت ہوں گے جو تمام عمر اس کی تمنا کرتے کرتے آخر قبر میں جا سماتے ہوں گے۔ ان دنوں یہ خیال خود بخود مر گیا کہ میرے حسن کو اپنی دلفریبی کے لئے وسیع تر حلقۂ اقتدار اور پر شور داد و تحسین کی ضرورت ہے اور پھر کبھی نہیں آیا۔ بچوں کا خیال بھی یوں آتا جیسے آسمان پر پھیلتے، دوڑتے بادلوں میں دور ایک ٹمٹماتا ستارہ جو ذرا سی جھلک دکھا کر یوں چھپ جائے کہ معلوم ہو کہ پھر کبھی نہ نکل سکے گا۔ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی آتا تو دل میں ہول اٹھنے لگتا۔

میں بار بار اس سے کہتی تھی کہ ہم اپنے اپنے شریک حیات سے قانونی طور پر الگ ہو کر ایک دوسرے کے بن جائیں۔ وہ یہ سن کر ہمیشہ سوچ میں ڈوب جاتا اور یہی فیصلہ دیتا کہ ابھی ٹھہر جاؤ، ہمارے اس فیصلے سے بہت سے ناکردہ گناہ لوگ جو ہم سے کسی نہ کسی رشتے سے بندھے ہوئے ہیں، ہماری سماجی روایات کے مطابق کبھی زندگی میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہ رہیں گے۔ ہمارے بچے نفسیاتی اپاہج بن جائیں گے اور زندگی کی کٹھن راہ پر ہمارے گناہوں کا بوجھ بھی سروں پر لادے اتنا لمبا سفر کیوں کر طے کر سکیں گے۔ ہم دنیا میں پھیلے ہوئے دکھوں میں اگر کمی نہیں کر سکتے تو کم از کم محض اپنی خود غرضی میں ان میں اضافہ تو نہ کریں۔ میں بغاوت پر تلی تھی کہ وہ بندھن جو کل ٹوٹ کر رہیں گے انھیں ہم آج توڑ کر اپنے ارمانوں کو سلامت بچا کر لے جائیں اور دوسروں کے لئے راستہ صاف کر دیں۔ ہم دونوں اپنی اپنی تھیوری کے مطابق دوسروں پر احسان کرنے کے فلسفے پر ڈٹے رہے اور آخرش تجویز شہریار پیدا کرنے پر ٹھہری۔ ہم نے سوچا تھا کہ جس طرح شوجی نے جہان کے سمندر متھنے سے جو زہر ابھرا تھا انسانیت کو بچانے کے لئے پی لیا تھا، اسی طرح وہ بچہ ہمارے پیار کے سمندر متھنے سے جو زہر پیدا ہوا ہے اس کو پی کر ہمارا پیار بچا لے گا" پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی "شوجی کی تو گردن نیلی ہو گئی تھی مگر ماشاء اللہ شہریار کی گردن تو بلور کی طرح صاف اور چمکدار ہے۔"

میں بھی ساتھ نبھانے کے لئے ہنس دیا اور یونہی کہا "آپ کی طرح" حالانکہ اس کی گردن پر بھی اب ثریا کی طرح سے جھریاں واضح طور پر نمایاں ہو رہی تھیں۔ اس

تعریف پر وہ واقعی خوش ہو گئی اور ایک بار گردن پر نادانستہ ہاتھ پھیر کر دیکھا بات اب قریب آ گئی تھی میں انجام جاننے کے علاوہ اس کے مقصد سے بھی واقف ہونا چاہتا تھا بے صبری سے پوچھا "پھر؟"۔"

"پھر شہریار کی ولادت سے قریباً مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے اس کا کورس ختم ہو گیا اگرچہ اسے ایک مہینہ کی چھٹی بھی تھی اور میں نے منت سماجت بھی کی کہ مجھے اس موقع پر تمہاری اشد ضرورت ہو گی مگر وہ نہ مانا اور کہنے لگا 'ہر معاملہ نہایت خوبی سے طے ہو چکا ہے' تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی اس نے ایک مہینہ چھٹیوں کا یورپ کی سیر میں گزارا اور واپس پاکستان پہنچ گیا۔ دنیا کے دکھوں میں کمی کرنے کا شوقین مجھ سے اس طرح لا تعلق ہو گیا تھا جیسے نر جانور' مادہ کو حاملہ کر کے ہو جاتے ہیں۔ اس نے نہ تو مجھے کوئی خط لکھا اور نہ کوئی پیغام ہی بھیجا جب دو اڑھائی ماہ بعد میں پہنچی تو بھی مجھ سے نہ ملا اور نہ ہی میں نے کوشش کی۔ پتہ چلا کہ وہ ریسرچ کے کام میں مصروف ہے' یا تو لیبارٹری میں قید رہتا ہے یا گھر میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تمام واقعہ کو اپنے ذہن کی سلیٹ سے بالکل صاف کر دیا تھا۔ بعد ازاں چند مرتبہ کچھ دعوتوں وغیرہ میں اتفاقاً اس سے آمنا سامنا ہوا تو ہم قطعی اجنبیوں کی طرح ملے۔ اسے دیکھ کر نہ تو کبھی میرا دل دھڑکا اور نہ اس کی بے رخی سے مجھے کوئی صدمہ ہوا۔ ہم دونوں جب وہ رہے ہی نہیں تھے جو کبھی تھے تو پھر دل کیسے دھڑکتا اور صدمہ کیوں ہوتا

حیرانی ہے کہ محبت کے اس چھوٹے سے وقفے میں کیا شوریدہ سری تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لئے ناگزیر بن گئے تھے مگر جو کچھ بھی تھا وہ وقفہ تھا بہت خوبصورت اس کی یاد اب بھی میرے خون کی گردش تیز کر دیتی ہے۔ خمار کی تکلیف سے خمر کے عالم کو برا کہنا زیب نہیں دیتا۔ دنیا میں کچھ بھی تو مفت نہیں ہوتا ایک نہ ایک طرح سے ہر چیز کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے وہ اپنے کئے پر پشیمان معلوم ہوتا تھا اس نے اپنے تاسف میں کبھی یہ تک نہ پوچھا کہ لڑکا ہوا تھا یا لڑکی اس کے اس رویے پر مجھے افسوس رہے گا۔ یا تو مول دے کر نہ روؤ یا پھر چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم نہ کرو میں واپس پہنچ کر زندگی کے معمولات میں یوں غرق ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو

میاں کی قربت سے اب بھی سرسوں کے تیل کی بو آتی تھی اور دھیان تنگ' گندی گلیوں کی طرف لوٹ جاتا تھا لیکن طبیعت میں سہار پیدا ہو چکی تھی کہ تنگ گندی

گلیاں تو ہوتی ہیں اور ان میں سے مستقل بو کے بھبکے بھی اٹھتے رہتے ہیں' کیا کیا جا
سکتا ہے یہ سب کچھ تو ایسے ہی ہے اور ایسے ہی رہے گا۔ بچوں کے ساتھ پہلے کی
نسبت بہت زیادہ محبت امڈ آئی تھی اور ان کا اس طرح خیال کرنے لگی جیسے پہلے کبھی
نہ کیا تھا میں چاہتی تھی کہ وہ یکدم بڑے ہو جائیں اور تعلیم مکمل کرکے اپنے پاؤں پر
کھڑے ہو جائیں اور مجھے آزاد چھوڑ دیں۔ مگر وقت میری آرزوؤں سے غافل اپنی
رفتار سے گھسٹتا رہا۔ طبیعت کا وہ اضطراب کہ کچھ معمول سے مختلف' انوکھا' ہنگامہ
خیز' اعصاب کو جھنجھوڑ دینے والا واقعہ ہو ختم ہو چکا تھا میں قانع اور اپنی حالت پر شاکر
ہو گئی تھی۔ شہریار جسے آپ کو سونپ دیا تھا اس کے بارے میں خیال آنے کو آپ
یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے اندھیری رات میں گہرے کنوئیں میں پانی دیکھنے کی کوشش۔
آپ ہزار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھئے کچھ نظر نہیں آتا البتہ پتھر پھینکیں تو پتہ چلتا ہے
کہ دور تہ میں کہیں پانی ہے ضرور۔ وہ جن کی قربت کی خاطر محبوب چھوڑ دیا تھا وہ
بھی ایک ایک کرکے زندگی کی جد و جہد میں شامل ہوتے گئے اور مجھے چھوڑ اپنی اپنی
راہوں پر چل نکلے۔ اب طبیعت میں ہنگامے کی طلب ہونی چاہیے تھی مگر وہ منزل تو
بہت دور پیچھے کہیں راہوں کی دھول میں کھو گئی۔ آزادی جس کی تمنا میں دم گھٹنے لگتا
تھا ایک بوجھل سل کی طرح میرے ہاتھوں میں پکڑا دی گئی تھی مگر اب اس کے رکھنے
کے لئے مجھے کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی آثار قدیمہ کو دیکھنے کی عقیدت اور جذبات
کے ساتھ بچے ملنے کے لئے کبھی آنکلتے ہیں اور ایک دو دن رک کر پھر اپنے اپنے
محاذوں پر لوٹ جاتے ہیں۔ ایک دن اخبار میں تھا کہ مشہور انجینئر شہریار وفات پا گئے
دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا مجھے بھولی ہوئی بات پھر ایک دم پوری شدت سے یاد
آگئی مجھے اس سے دوبارہ عشق ہو گیا اس کی موت کے بعد مجھے ایک غیر متزلزل یقین
نے گھیر لیا کہ ہمیں ہمیشہ ایک دوسرے سے روز اول والی جنوں خیز اور ہنگامہ پرور
محبت رہی اور ہم دونوں نے محض مصلحت کی خاطر اس کو دبا دیا اور بے اعتنائی کا لبادہ
اوڑھ کر بیٹھ گئے مجھے اپنے اتنے برسوں کے جھوٹے ضبط پر شدید احساس جرم ہونے
لگا اس وقت کے غم میں میرے دل کا ریشہ ریشہ کٹتا جا رہا تھا جو ہمیں میسر تھا اور جسے
ہم دونوں احمقوں کی طرح لحظہ بہ لحظہ اپنے ہاتھوں سے قتل کرتے گئے غم کے بوجھ میں
کون ہاتھ بٹا سکتا ہے' ہر کسی کو اکیلے ہی اٹھانا پڑتا ہے لیکن اس کے اظہار پر بھی

بندش ہو تو انسان دیوانہ ہو اٹھتا ہے میں ایسی ہی دیوانگی میں اٹھ کر یہاں چلی آئی ' اسے دیکھنے ' اسے دیکھ کر صرف مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ اتنا خوبصورت ہے اور اتنا بڑا ہو گیا ہے اور آپ لوگ اسے اتنی محبت سے پال رہے ہیں وہ آپ کا بیٹا ہے ' اگر میرا بھی رہتا تو کیا فرق پڑتا ' اور چند برسوں میں یہ بھی اپنے پروں سے اڑتا افق کو کھوجنے چلا جا رہا ہو گا ہم میں سے ہر کوئی افق کی تلاش میں اڑان لگاتا ہے مگر افق کبھی آنہیں چکتا۔ وہ اور آگے بڑھ جاتا ہے ' افق کہیں ہو تو آئے وہ دراصل ہے ہی نہیں ' محض واہمہ ہے ' اس کے باوجود ہم سب شاید اپنی فطرت سے مجبور اس تک پہنچنے کے لئے نکلتے ضرور ہیں ۔ ایک دن آئے گا کہ وہ آپ کے پاس سے بھی اڑ جائے گا۔ آپ کی زندگی کے خلا کو اور گہرا کرتا ہوا یہاں کچھ بھی تو دائمی نہیں کوئی محبت ' کوئی تعلق ' کوئی پر شور جذبات سے نچڑتا ہوا لمحہ ۔ جب وقت کو جس کے دھارے میں پوری کائنات بہتی جا رہی ہے اس کو بھی قرار نہیں تو پھر اس میں بہنے والی کسی بھی چیز کو ثبات کیوں اور قرار کیسا۔ مجھے ابھی خیال آیا ہے کہ میرا وہ غیر متزلزل یقین کہ ہمیں ہمیشہ ایک دوسرے سے روز اول والی جنوں خیز محبت رہی ' غلط ہے وہ سب ایک وہم ہے جو شاید اس کی موت کے سبب اپنی فنا کی قربت کے احساس نے مریضانہ طور پر میرے ذہن میں پیدا کر دیا۔ ڈوبتے نے تنکے کو سہارا بنانے کی کوشش کی اور ہمیشہ کی طرح ناکام رہا۔ یہاں رہوں تو کیا ہے کچھ نہیں ' واپس چلی جاؤں تو وہاں کیا ہے ' کچھ نہیں ' یہ شہریار وہ شہریار تو نہیں بن سکتا ' اور اگر بن بھی سکے تو کیا ہے ۔ اس کی پیدائش کے دس سال بعد تک وہ اسی شہر میں جس میں ' میں زندہ تھی ' زندہ رہا تو کیا فرق پڑا ' کچھ نہیں ۔ اگرچہ تند و تیز جذباتی لگاؤ کو تادیر زندہ رکھنا ناممکن ہے لیکن اگر ایسا ممکن ہوتا اور ہم جذبات کے طوفان کو ابھارے ایک دوسرے سے ملتے بھی رہتے تو کیا فرق پڑتا۔ کچھ نہیں ہم اپنی زندگیوں کے دوران ذہن کے کائنات جتنے وسیع خلاؤں میں تنہا گھومتے رہتے ہیں اور موت کے بعد ذہن جتنی وسیع کائنات کے خلاؤں میں تنہا گھومتے رہیں گے یہی ہمارا مقدر ہے۔ میں کل واپس چلی جاؤں گی سرسوں کے تیل کی بو کے پاس اور کہاں جا سکتی ہوں ' کہیں نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر چل پڑی ۔

میں نہ تو اسے الوداع کہنے کے لئے اٹھ سکا نہ ہی کوئی بات کرنے کے لئے سوجھ

سکی ' صرف خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا وہ جو کوہ وقار بنی ایک ٹھلنے سے آئی تھی
وقت کی طوفانی لہروں پر ایک تنکے کی طرح بے بس جا رہی تھی ' ریستوراں کا دروازہ
کھول کر بازار میں چلتے ہوئے انسانوں کے اندھے سیلاب میں ایک دوبار ڈوبنے والے
کی طرح ابھر کر نظر آئی اور پھر گم ہو گئی۔

اب ‘جب اور تب

”صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں ۔ عجیب آدمی ہو اب آ رہے ہو جبکہ شام کے پانچ بجنے والے ہیں ۔ بیسیوں مرتبہ تمہارے گھر ٹیلیفون کیا ۔ ہر بار یہی گردان کہ گھر پر نہیں ہیں ۔ دو مرتبہ ڈرائیور کو اس امید پر دوڑایا کہ اگر آ گئے ہو تو لے آئے ۔ تم جانتے ہو گاڑی میرے باپ کی نہیں ۔ راشد اور اس کے بچے ایک منٹ کے لئے گاڑی کی جدائی برداشت نہیں کرتے ۔ بہو کا دوپٹہ رنگانے کے لئے ڈرائیور بازار کے دس چکر لگا سکتا ہے ۔ لیکن میرے کام سے چند فرلانگ جانا ہو تو ہزار نخرے کرتا ہے

مظفر نے رعشہ زدہ ہاتھوں سے چھڑی پر اپنا بوجھ سنبھالتے ہوئے قدم قدم برآمدے کی سیڑھیاں طے کیں اور کمال کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر پہلے سانس درست کیا اور پھر کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا ۔ ”تم کسے ٹیلیفون کرتے رہے ‘کس کے ہاں گاڑی بھیجتے رہے ‘ میں تو آج پورے ایک ہفتے کے بعد گھر سے نکل سکا ہوں ۔ برا ہو اس اختلاج قلب کا ۔“

”او ہو ! تم مظفر ہو ‘ میں سمجھا حسن ہے ۔ میری آنکھوں میں دراصل موتیا اتر رہا ہے ۔ اب شام کے جھٹپٹے یا ذرا فاصلے سے پہچاننے میں مغالطہ ہو جاتا ہے ۔ چلو اچھا ہوا تم چلے آئے بعد میں بھی تمہیں تلاش کرانا ہی تھا ۔ شاید حسن بھی ابھی آجائے ۔ ایک نہایت اہم مشورہ کرنا ہے تم لوگوں سے ۔“

برآمدے میں کھلنے والا دروازہ ٹھائیں سے بند ہوا اور راشد کا بڑا بیٹا ' اٹھارہ انیس سال کا نوجوان ' پورچ کے ایک کونے میں کھڑے موٹر سائیکل کی طرف دوڑتا جا رہا تھا۔ کمال نے آواز دی " راشد ' راشد "

پھٹ پھٹ ' موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کا شور بلند ہوا۔ کمال نے کرسی سے اٹھ کر آواز دی " روفی ' او روفی ' ادھر آؤ "

نوجوان نے موٹر سائیکل بند کیا اور چہرے پر جھنجلاہٹ اور بد دلی کے آثار پھیلائے آگیا " جی "

" میں تمہیں بلا رہا ہوں اور تم بھاگے جا رہے ہو "

" آپ ڈیڈی کو بلا رہے تھے "

کیا تمہارا فرض نہیں کہ جواب دیتے۔ کہاں ہے راشد۔ دفتر سے نہیں آیا ؟

" وہ صبح ہوائی جہاز سے پشاور دورے پر چلے گئے "

" اچھا ! مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ چلو خیر تم ایسے کرو کہ ذرا حسن صاحب کے گھر ٹیلیفون کرو کہ اگر واپس آگئے ہوں تو فوراً یہاں چلے آئیں اور اگر ابھی نہ پہنچے ہوں تو پیغام دے دینا کہ آتے ہی ادھر آجائیں۔ مظفر صاحب بھی ان کے منتظر بیٹھے ہیں سمجھ گئے ؟ "

روفی نے پیٹھ پھیر کر جاتے ہوئے ' جی ' کہا اور ٹیلیفون کرنے چلا گیا۔

" مظفر یار ! اس لڑکے کا رنگ اگر اپنے باپ کی طرح سانولا نہ ہوتا جو اس نے اپنی ماں سے پایا تھا اور بدن ماں کی طرح سوکھا سڑا نہ ہوتا جو اس نے اپنے باپ سے پایا تھا تو یہ مجھ سے کافی مشابہ ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے اس میں اپنی جوانی کی جھلک تیرتی سی نظر آتی ہے "

" ہاں ! کچھ ہے۔ مگر ہم تینوں کی تمام اولاد ' بلکہ اولاد در اولاد میں بھی کوئی ایک بچہ ایسا نہیں جو حسن و جوانی میں ہمارا لگا کھاتا ہو "

اتنے میں موٹر سائیکل سٹارٹ ہوا اور روفی پھٹ پھٹ کا شور مچاتا ' تیر کی طرح بیرونی دروازے سے باہر سڑک پر نکل گیا۔ کمال کہہ رہا تھا " دیکھا اس حرام زادے کا حال " کہ اتنے میں دوسرے دروازے سے موٹر داخل ہوئی۔ مظفر پکار اٹھا " لو ! حسن

آگیا"

دس گیارہ سال کی ایک چھوٹی سی لڑکی سر پر گاڑھے کی اوڑھنی لئے ' ننگے پاؤں ان کے قریب کھڑی کہہ رہی تھی " بابا جی ' بابا جی ۔ روفی صاحب کہہ گئے ہیں کہ وہ آدمی ابھی آجائے گا ۔ وہ دونوں حسن کی آمد کو پورے انہماک اور توجہ سے دیکھنے میں مصروف تھے اور لڑکی اپنی بات دھرائے جا رہی تھی ۔

چہرے پر جھریوں کا جال لئے ' بائیں ٹانگ سے لنگڑاتے اور بائیں بازو کو بے اختیار جھلاتے حسن صاحب چلے آ رہے تھے تینوں کے چہرے خوشی اور اپنائیت کے جذبات سے دمک رہے تھے اور خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے ۔

" کمال ! تو نے یہ صبح سے کیا ٹیلیفون اور پیغامات بھیج بھیج کر میرے گھر والوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے ۔ خیر تو ہے ؟ "

" ارے خیر ہی ہے ۔ مگر پہلے تو یہ بتا کہ صبح سے کہاں گم تھا "

" ایک بجے تک ہسپتال میں معائنہ کراتا رہا ' پھر بڑی لڑکی کے گھر چلا گیا ' اب آیا تو .... "

لڑکی پھر ممیائی " بابا جی ' بابا جی "

" اری تو کیا سر کھا رہی ہے " کمال جھلا کے بولا ۔

" جی روفی صاحب کہہ گئے ہیں .... "

" اچھا ' اچھا ۔ ٹھیک ہے ۔ وہ آگئے ہیں ۔ تو جا "

" نہیں جی ایک بات اور ہے ۔ بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ سردی ہو گئی ہے آپ کمرے میں آجائیں نہیں تو پھر دمے کا دورہ پڑ جائے گا ۔ "

کمال تو یوں غصے میں آگیا جیسے لڑکی نے اس کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو " مجھے خوب معلوم ہے کہ کب کمرے میں جانا ہے ۔ اب جا اور جاکے اپنی بیگم صاحب سے کہہ دے کہ آئندہ مجھ پر اس طرح حکم چلانے کی کوشش نہ کرے ۔ میں بہت ٹیڑھا آدمی ہوں ۔ "

مظفر نے کہا " یار ! وہ تیری بھلائی کے لئے کہہ رہی ہے اور تو بلا وجہ رعب گانٹھ رہا ہے ۔ واقعی سردی ہو رہی ہے ۔ اب اندر چلنا ہی چاہیے "

تو نہیں جانتا ۔ وہ میرا بھلا ولا کچھ نہیں چاہتی ۔ وہ تو محض ڈاکٹروں کی فیسوں

کے غم میں دبلی ہو رہی ہے۔ میں صبح کا مرتا رات مرجاؤں۔ اس کی بلا سے۔"

تینوں برآمدے سے اٹھ کر کمرے میں چلے آئے۔ آتش دان میں دھڑا دھڑ آگ جل رہی تھی وہ کرسیاں کھینچ کر سامنے بیٹھ گئے۔

حسن نے پوچھا "ہاں بھئی، بتاؤ بات کیا ہے؟"

کمال نہایت احتیاط سے اونی ٹوپی کو کھینچ کھینچ کر ماتھے اور کانوں کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مظفر بولا "کمال کسی نہایت اہم معاملے میں ہم سے مشورہ کرنا چاہتا ہے"

کمال نے کہا "نہیں حسن، مظفر غلط کہہ رہا ہے۔ مشورہ تو وہاں کیا جاتا ہے جہاں کسی مسئلے کے بارے میں آدمی گوگو کے عالم میں ہو، میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے اور وہ فیصلہ حتمی ہے۔ اب اس میں کسی مشورے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور نہ ہی کسی رائے زنی کی گنجائش ہے۔ مجھے صرف اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تم دونوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ میں اسی وقت اور اسی جگہ تم دونوں پر نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں عیاں کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی ایک نے یا دونوں نے فردا" فردا" یا مشترکہ طور پر یا اپنے رویے یا الفاظ کے ذریعے میری امداد کرنے میں بالترتیب پس و پیش کی یا لیت و لعل کا اظہار کیا تو میں تم دونوں سے فردا" فردا" یا مشترکہ طور پر حسب ضرورت موقع اپنے تعلقات تا حیات ختم کرلوں گا۔ اس کے علاوہ میں اس بات کا اعلان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر تمہاری امداد نہ بھی میسر آ سکی تو میرے پاس ایسے متبادل ذرائع موجود ہیں جن کی وساطت سے میں اپنے فیصلے کو بخوبی اور بطریق احسن اس کے آخری انجام تک پہنچانے کا کلی طور پر اہل ہوں۔ نیز یاد رکھو کہ اگر تم میری اس شدید ضرورت کو پس پشت ڈالتے ہوئے امداد سے دست کش ہو گئے تو وہ دوستی کی شفاف جبیں پر ایک کلنک کا ٹیکہ ہو گا کہ جس کو زندگی اگر ازل سے لے کر ابد تک بھی تاسف کے آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کرتی رہے تو ......

حسن بیچ میں بول پڑا "کمال یہ درست ہے کہ تم زندگی کا بیشتر حصہ جج رہے ہو اور یہ بھی درست ہے کہ تم ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ قبل حکومت کے محکمہ قانون سازی میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم کسی

ذاتی معاملہ میں بھی دوستوں سے اس طرح بات چیت کرو جیسے کسی ایکٹ کی دفعات تحریر کر رہے ہو یا کوئی عدالتی حکم نامہ جاری کر رہے ہو۔ بتاؤ مظفر اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ یہ ہم سے ایسا سلوک کرے جیسے کہ ہم کوئی چور' ڈاکو ہوں اور اس کی عدالت کے کٹہرے میں جواب دہی کے لئے حاضر ہوں' اس نے نہ تو کام بتایا نہ اس کی نوعیت' بس دھونس پر دھونس دیئے جا رہا ہے کہ اگر میری بات نہ مانی تو یہ کردوں گا۔ وہ کر دوں گا۔

جا' پہلے تجھے ہمارے خلاف جو کچھ کرنا ہے کر لے پھر ہم دیکھ لیں گے۔ یہ بھلا کوئی طریقہ ہے! کوئی انسانیت ہے!"

"نہیں' نہیں حسن تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ صرف معاملے کی اہمیت اور نزاکت کو پوری طرح واضح کرنا مقصود تھا۔ حاشا' یہ ارادہ نہیں تھا کہ تمہاری یا مظفر کی دل آزاری ہو۔ ہو سکتا ہے الفاظ کے انتخاب میں غلطی ہو گئی ہو' تاہم میں معافی چاہتا ہوں۔"

حسن بولا "الفاظ کے انتخاب میں؟ تم نے صریحا ہم پر بے اعتمادی کا اظہار کرکے ہماری توہین کی ہے۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ ہم نے کب اس کی مدد نہیں کی۔ وہی ایک بات لے لو' آج سے پچاس سال پہلے' وہ کیا نام تھا اس لڑکی کا جس کی مینڈک جیسی آنکھیں تھیں اور خچر جیسے کولھے تھے۔"

مظفر نے لقمہ دیا "روشن"

"ہاں' ہاں روشن نام تھا اس کا' جس کی عاشقی کا جناب اس زمانے میں دم بھرا کرتے تھے۔ پوچھو اس سے اناروں کے بے آباد باغ میں ان کی ملاقاتیں کیسے ہوا کرتی تھیں۔ جیبوں میں چاقو ڈال کر کتوں کی طرح چوکس کون پہرہ دیا کرتے تھے؟ مظفر یار روشن کے وہ بھائی کتنے خوفناک تھے۔ ان کو کبھی اگر پتہ چل جاتا اور وہ پہنچ جاتے موقع پر تو کیا زبردست معرکہ ہوتا۔ مزا آجاتا۔ پھر وہ روشن کو بھگانے کا کتنا عمدہ پلان بنایا تھا۔ راتوں رات چاروں کو علاقہ غیر میں پہنچ جانا تھا۔ مگر موقع آنے پر خود بزدلی دکھا گیا۔ ہزار سمجھایا مگر نہیں مانا۔ اس کے بغیر ہم دونوں کیا کر سکتے تھے۔ کہتا تھا ہم اسے کہاں رکھیں گے' کہاں سے کھلائیں گے' ابھی تو ہماری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔ کون ہمیں نوکری دے گا بزدل کہیں کا۔ مجھے تو اب بھی وہ باتیں یاد آتی ہیں تو

جوش سے میرا بدن تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔"

کمال نے نہایت گمبھیر آواز میں ' ایک ایک لفظ الگ الگ ادا کرتے ہوئے کہا " اب کے میں نے خود پلان بنایا ہے مکمل اور جامع پلان "

حسن نے بے کل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کا ہے کا؟"

" تم لوگ مجھے بات کرنے کا موقع دو تو بتاؤں۔"

مظفر نے پوچھا " روشن کو بھگانے کا؟"

" ہاں۔"

" روشن ابھی ہے؟"

" ہاں! ہے"

" اب اس میں کیا رہ گیا ہو گا"

" اس کا ابھی بگڑا کیا ہے"

" تم نے خود اسے دیکھا ہے؟"

" ہاں ' آج صبح گیارہ بجے کے قریب میں ہسپتال سے اپنی آنکھیں دکھا کر گاڑی میں واپس آرہا تھا۔ دوستو! یہ موتیا بھی عجیب بکواس ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ جب تک یہ اچھی طرح پک نہ لے اور نظر مکمل طور پر بند نہ ہو جائے اس وقت تک آپریشن نہیں ہو سکتا۔ شاید تم دونوں اس امر سے بے بہرہ ہو کہ موتیے کے آپریشن کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ مریض ......" گولی مارو ڈاکٹروں اور موتیے کو۔ پھر کیا ہوا؟"

" ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں گاڑی میں واپس آرہا تھا۔ ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔ جب روشن کے بنگلے کے سامنے سے گزرے تو میں نے یونہی ادھر جو آنکھ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ روشن سڑک والے گیٹ میں سے داخل ہو کر اپنے گھر کی طرف بڑھی چلی جا رہی ہے۔ میں تو ششدر رہ گیا"

" مگر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو وہ روشن ہی تھی۔"

" میں خود عینی شاہد ہوں اور اس کے علاوہ میرے پاس واقعات و حالات پر مبنی ایسے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں کہ جن کے سامنے آپ دونوں کے لئے میرے اس موقف سے انحراف کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ نیز اس تمام واقعہ میں چند ایک

استفسار طلب امور ہیں جن کی طرف آپ کی توجہ ابتدا ہی میں منعطف کرانا ضروری

"کمال خدا کے لئے سیدھے سادے انداز میں بات کیوں بتا نہیں چکتے' بار بار روکنے کے باوجود تم پھر اسی نہج پر کیوں چل پڑتے ہو؟"

"میرے دوستو! جس فاصلے کو طے کرنے میں پچاس برس لگ گئے اس کو واپس طے کرنے کے لئے کچھ تھوڑی سی مہلت تو دو۔ اٹھارہ سال کی عمر والا جوش و جذبہ واپس آ رہا ہے۔ میں ابھی سے اسے اپنی رگوں میں سر اٹھاتے' سرسراتے محسوس کر رہا ہوں۔ تم بظاہر مجھ سے ذرا تیزی سے واپس لوٹ رہے ہو لیکن میں چاہتا تو اب تک کبھی کا اٹھارہ سال کا ہو چکا ہوتا۔ مگر یہ عمل ذرا دھیرج اور آہستگی سے ہو تو اچھا ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ ہم تینوں اکٹھے اٹھارہ سال کی عمر کو واپس پہنچیں' ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پچاس بچپن برس کی عمر پر آکر اٹک جاؤ اور میں نوجوانی کے جذبے میں سرشار' تمہارے بڑھاپے سے بیزار' اپنی مہم پر اکیلا روانہ ہو جاؤں۔ یوں مجھے ساتھی کہاں سے ملیں گے۔ آج کے نوجوان تو مجھے نوجوان تسلیم نہیں کریں گے۔ طبقہ پرستی اور گروہ بندی کی بیماری کہاں نہیں؟ خدا نخواستہ اگر ایسا ہوا تو ایک بار پھر سارا پلان دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ پہلے جو جوانی میں میری بوڑھی سوچ کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔ اب بڑھاپے میں کہیں میرے ساتھیوں کے بڑھاپے کی وجہ سے ناکام نہ ہو جائے۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اس خود ملامتی اور پشیمانی کی نذر ہو گیا کہ میں نے کیوں موقع کا فائدہ نہ اٹھایا۔ ہمہ وقت میرے جگر میں تاسف کا خنجر گڑا رہا۔ آج اس خنجر کو نکال پھینکنے کا وقت آگیا ہے میں اس دوسرے موقع کو کسی حالت میں بھی ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا کیونکہ تیسرا موقع جب تک آئے گا ہمیں مرے ہوئے برسوں گزر چکے ہوں گے اور میرے پنجر میں ایک زنگ آلود خنجر اس طرح پڑا ہو گا جیسے کسی نے اسے وہاں لڑھکا دیا ہو"

"وہ شخص جسے کبھی اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا' اپنے شعور کی راستی اور اپنے جذبوں کی صداقت پر کبھی اعتماد نہیں رہا' آج وہ شخص بڑھاپے کو آڑ بنا کر ہم پر طعنہ زنی کی کوشش کر رہا ہے۔ دیکھو! پلان کا لفظ تمہارے منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ مظفر کے ہاتھوں کا رعشہ ختم ہو گیا۔ مظفر! دونوں ہاتھ سامنے پھیلا کے دکھاؤ اسے۔

خوب دیکھ لو' پرکھ لو' جانچ لو۔ پلان کا لفظ تمہارے منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ میری ٹانگ اور بازو کا فالج جاتا رہا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کرنل حسن کو کبھی فالج ہوا تھا۔ میں ابھی' اسی وقت ہزاروں جوانوں کی پریڈ کی سربراہی کر سکتا ہوں۔ اس طرح کاشن دوں گا کہ پورا پریڈ میدان گونج گونج اٹھے"

حسن اٹھ کے کھڑا ہو جاتا ہے اور کمرے میں پریڈ کرکے دکھاتا ہے اور بولتا جاتا ہے۔ "اس طرح مارچ کرتے ہیں' چھاتی پھلا کر' گردن اکڑا کر' سامنے نظر جما کر' زمین میں یوں ایڑی گاڑ کے چلتے ہیں' یوں' یوں' یوں۔"

کمال نے کہا "حسن بیٹھ جاؤ۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن ہمیں ابھی رعشے کی ابتدا اور کرنیلی سے بہت پیچھے پہنچنا ہے لیکن کوئی بات نہیں ہم اسی طرح پیچھے ہٹتے رہے تو منزل دور نہیں۔ ہاں! تو روشن کو اغوا کرنے کا پلان اس طرح ہے کہ ...."

مظفر نے ٹوکا "تم جج ہو کر محبت کی ماری روشن کو پناہ دینے اور اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اغواء کا لفظ استعمال کر رہے ہو۔ اغواء میں تو زبردستی اٹھا لے جانے کا تصور ہے اور روشن تو اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ جائے گی"

کمال نے سمجھاتے ہوئے کہا "تم جج کے عہدے کی بات کرتے ہو اور میں تو اب ایسی سٹیج پر پہنچ گیا ہوں کہ قانون کی تعلیم سے بے بہرہ ہو چکا ہوں مظفر! خدا کے لئے واپسی میں جلدی کرو تم تو بہت پیچھے رہ جاتے ہو' ایسے کیونکر کام چلے گا"

حسن نے کہا "کمال بھئی اغواء کے پلان پر تو بعد میں بحث کریں گے پہلے یہ تسلی کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ روشن ہے بھی کہ نہیں۔ اس کی بھول میں کسی اور کو لے اڑیں اور بلا وجہ مصیبت میں پھنس جائیں"

"یار تم بھی غضب کرتے ہو۔ میں بتا جو رہا ہوں کہ میں نے اسے خود اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"آنکھوں سے دیکھا ہے۔ چہرہ دیکھا تھا؟"

"نہیں"

"تو پھر؟"

"وہ ہزاروں' لاکھوں کے مجمع میں بھی کھڑی ہو تو میں ایک نظر میں ڈھونڈ نکالوں اور تم کہتے ہو کہ میں اسے پیچھے سے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا وہی خوبصورت سر' بے

نیازی سے اڑتے ہوئے ریشمی سیاہ بال ' لہراتی ہوئی مست چال ' بھرا بھرا بدن ' لمبی گردن 'گدرائے ہوئے کولھے جنہیں تم اپنی کورذوقی کے سبب خچر کے کولھے کہا کرتے ہو۔"

"ہاہاہا" مظفر ہنسا۔ "اس کی انہی باتوں پر تو انگریزی نظم کے پروفیسر شو دیال نے اس کا نام دشمن فن رکھا تھا۔ دشمن فن! ہاہاہا"

کمال نے حسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے تو امید نہ تھی لیکن مظفر بھی خوبصورتی سے ابھرتا آرہا ہے۔ شاباش مظفر ' شاباش۔ ہمت کئے چلو۔"

حسن نے توجہ دئے بغیر کہا "ایسے بات نہیں بنے گی۔ تم وہیں سے قصہ شروع کرو جب وہ دروازے سے اندر چلی جا رہی تھی۔"

"اچھا تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ لان کے ساتھ ساتھ نیم دائرے میں بنی ہوئی روش پر چلی جا رہی تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پورے زور سے آواز دی۔ " روشن!" ڈرائیور نے گھبرا کے گاڑی روک دی۔ میں کار سے تیر کی طرح نکل کر دروازے کی طرف لپکا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق عمارت اور بیرونی دیوار کے درمیان والی گلی میں سے گزرتی ہوئی پچھلے صحن کے دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے پھر آواز دی ' روشن! روشن! اس نے پلٹ کر ایک بار مجھے پھاٹک والے دروازے کے درمیان کھڑے پکارتے ہوئے دیکھا اور پھر دہلیز پھلانگ کر اندر چلی گئی۔ وہی کھلتا ہوا شہابی رنگ۔ وہی موٹی موٹی ....."

"باہر ابلتی ہوئی مینڈک کی سی آنکھیں" حسن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

کمال کو غصہ آگیا "حرام زادے باز آ جا اس کا مذاق اڑانے سے ' نہیں، تو میں تیری ہڈی پسلی ایک کردوں گا۔ میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تو جب بھی اس کے متعلق بات کرتا ہے تو اسی طرح کی جلی کٹی بات کرتا ہے۔ کل شام میں ان کے لان میں لگے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں اسے ملا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ کالج سے آرہی تھی تو تم سائیکل پر سوار اس کے پاس سے گزرے اور اس کا پلو کھینچنے کی کوشش کی۔ وہ خوفزدہ ہو کر فٹ پاتھ پر ہو گئی تو تم پھر آگے سے چکر لگا کر واپس آئے اور دوبارہ اس کے پاس سے گزرے اور موٹی خچر کا آوازہ کس کے بھاگ گئے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ تم نے کسی کے ہاتھ اسے محبت نامہ بھیجنے کی کوشش کی تھی

جو اس نے لینے سے انکار کر دیا اور تم پر اور تمہاری محبت پر تھوک دیا تو تم نے بدلہ لینے کے لئے اور اپنا حسد اور جلاپا مٹانے کے لئے اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنے کمینے اور ذلیل ثابت ہو گے کہ اپنے ایسے دوست کی محبوبہ پر بھی وار کرنے سے نہ ٹلو گے جس نے عشق میں تمہیں اپنا راز دار بنایا ہے۔"

"کمال تم نے میرے خلاف اتنے سنگین الزامات لگائے ہیں کہ میرے لئے ان کا سنجیدگی سے جواب دینا لازم ہو گیا ہے۔ خط میں نے اسے ضرور لکھا تھا' لیکن اس وقت جب تمہاری عاشقی تو درکنار تم نے اسے دیکھا تک نہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تم نے روشن کو بھی بتا رکھا ہے کہ مظفر اور میں دونوں اس راز سے واقف ہیں۔ اس لئے جب میں اس کے قریب سے گزرا تو بغیر سلام کیے آگے بڑھ جانا مناسب نہ سمجھا میں نے آہستہ سے سلام کیا' اس نے کوئی جواب نہ دیا میں سمجھا اس نے سنا نہیں اس لئے واپس آنا پڑا۔ دوبارہ ذرا اونچی آواز میں سلام کر کے چلا گیا۔ اب اتنی سی بات کا وہ بتنگڑ بنانا چاہے تو بنا لے۔ البتہ موٹی خچر کہنے کا جہاں تک تعلق ہے وہ اغلباً" میں نے نہیں کہا' ہم آپس میں جب بھی باتیں کرتے ہیں تو میں ہمیشہ اسے موٹی خچر کہا کرتا ہوں۔ اب عادتاً شاید اس کے سامنے بھی منہ سے نکل گیا ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔"

"حسن! مانا کہ تم نے اسے محض سلام کیا تھا۔ لیکن کیا تم اتنے ہی بچے ہو کہ نہیں جانتے کہ ایک معزز خاندان کی شریف لڑکی کو ایک ناواقف آدمی کا راہ چلتے میں سلام کرنے کا لوگ کیا کیا مطلب نہیں نکال سکتے۔ یہ سب تم نے دانستہ اس کو بدنام کرنے کے لئے کیا اور اس کی تذلیل کرنے کے لئے بر سر عام اسے موٹی خچر بھی کہا' میں اس کا بدلہ لے کر رہوں گا۔"

"ہوش کی دوا کرو کمال ہوش کی۔ مجھے ہاتھ اٹھانے پر مجبور نہ کرو' معزز خاندان کی شریف لڑکی؟ اور کچھ سننا ہے میرے منہ سے' راہ چلتے میں جو تجھ سے پھنس گئی وہ شریف لڑکی ہے جو رات کے اندھیرے میں اپنے گھر کے لان میں چھپ چھپ کر تجھ سے ملتی ہے وہ شریف لڑکی ہے؟ جو چمکتے دن میں کالج سے کھسک کر اناروں کے باغ میں پہنچتی ہے وہ شریف لڑکی ہے؟ شریف لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں؟ اس دو کوڑی

کی چھوکری کی خاطر اپنے دوست سے لڑنا چاہتا ہے تو لڑلے۔ ابھی ' اسی وقت ' میں تیار ہوں۔"

دونوں لڑنے کے لئے اٹھ کے کھڑے ہو گئے ' مظفر بازو پھیلائے ان کے درمیان آگیا۔ "ارے کیا کر رہے ہو عقل کرو ' تم تو جلدی جلدی میں اٹھارہ سے بھی دو تین سال پیچھے نکل گئے۔ تمہاری اس کج بحثی اور جھگڑے سے تو ہم تینوں کی پوری زندگیوں پر محیط ایک اور صرف ایک خواہش کو پورا کرنے کا آخری موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لڑائی کو چھوڑو ' آرام اور تحمل سے پلان کی بات کرو۔"

"مظفر! مجھے اس سے صرف ایک بات اور پوچھ لینے دو کہ کیا وہ بہری تھی جو اس نے پہلی بار اس کا سلام نہیں سنا اور یہ دوبارہ سلام کہنے واپس گیا۔"

"مظفر! تم اس سے پوچھو کہ کیا وہ بہری تھی جو اس نے پھاٹک پر سے اس کے چیخ چیخ کر روشن پکارنے پر کوئی جواب نہیں دیا" حسن نے کہا۔

"حسن! میرے دوست وہ بہری نہیں ' سوچو تو! گھر والوں کے خوف اور زمانے کے ڈر سے مجھے وہ اسی وقت بھلا کس طرح مل سکتی تھی۔ میں ابھی وہیں کھڑا تھا کہ وہ فوراً دوسری منزل پر اپنے کمرے میں پہنچی اور جھٹ سے کھڑکی کھول کر ایک ادائے محبوبانہ سے دائیں ہاتھ کی انگلیاں ہونٹوں سے چوم کر میری جانب ہوا میں لہرا دیں۔ اور پھر ہاتھ کے اشارے سے جانے کے لئے کہا اور اشارے ہی سے سمجھایا کہ پھر آنا بیچاری ڈرتی ہو گی نا ' میں نے اسی طرح اپنی انگلیاں ہوا میں لہرا کر وہ اڑتا ہوا بوسہ پکڑ کر اپنے ہونٹوں پر چپکا لیا۔ غور سے میرے ہونٹوں کو دیکھو۔ ان پر اب بھی اس بوسے کی دمک باقی ہو گی۔ حالانکہ آٹھ دس گھنٹے کا وقفہ گزر چکا ہے۔"

"کمال! تم تو کہتے تھے کہ تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔"

"اس وقت مجھے یاد نہیں رہا ہو گا۔ باقی بات تو سنو ' ان کے پھاٹک کے پاس ہی ایک کھوکھے والا سگریٹ وغیرہ کا کھوکھا لگا کے بیٹھا ہے میں پھاٹک سے کھسک کر اس کے پاس پہنچا۔ پوچھا میاں! یہاں آج کل کون رہتا ہے؟ جانتے ہو اس نے کیا بتایا۔

"کیا بتایا؟"

"کہ پہلے تو کوئی کرایہ دار رہتے تھے۔ اب چند دنوں سے کوٹھی کے مالک جو

عرصے سے کراچی میں رہتے تھے خود آکر آباد ہو گئے ہیں " کمال نے استادوں والا لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا ' اب بھی تم دونوں کو اس کے روشن ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک ' شبہ رہ گیا ہو تو بات کرو ۔ "

دونوں بیک زبان بولے " کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا ' تم برحق ہو ۔ "

" تو پھر سنو ۔ پلان اس طرح ہے کہ ہم رات ذرا اور گزر جانے پر حسن والی کار میں یہاں سے چلیں گے ۔ "

مظفر نے پوچھا " ڈرائیور بھی ساتھ ہو گا ؟ "

" ابے احمق ! ڈرائیور کو ساتھ لے جا کر مرنا ہے ۔ حسن چلائے گا گاڑی ۔ ایک نمبر ڈرائیور ہے " ہاں میں چلاؤں گا ۔ پہاڑوں کی گھاٹیوں اور پیچ دار موڑوں پر میں چیں چیں موڑ کاٹتا ' کار کو ہوا کی طرح اڑاتا ہوا لے جاؤں گا ۔ "

جوش اور جذبے میں لپٹا ہوا ہنسی کا فوارہ مظفر کے سینے سے ابل کر نتھنوں اور ہونٹوں سے بے ساختہ بہہ رہا تھا ۔ " ہا ہا ہا کتنا مزا آئے گا ہمارے بال اڑ اڑ کر ماتھے پر بکھر رہے ہوں گے ۔ ہم آگے اور آگے ہی بڑھتے جا رہے ہوں گے ۔ "

" روشن کا رنگین آنچل پھڑ پھڑا رہا ہو گا ۔ "

" سارے شہر میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی ۔ ہر گھر میں ہماری داستان دہرائی جارہی ہوگی ۔ " " پولیس ہمارے پیچھے لگی ہو گی ۔ زندگی میں پہلی بار سنسنی کی تیز رو ہمارے بدنوں میں دوڑ رہی ہو گی ۔ "

" یارو ! ذرا سوچو تو ۔ ہم مہم جوئی پر روانہ ہوں گے ۔ کتنا لطف آئے گا ۔ "

" آخر ایک بار تو ہم بھی پوری کائنات میں پھیلی ہوئی زندگی اور اپنے زندہ ہونے کے احساس کو اپنے اندر ایک سطح پر لا کر دیکھ سکیں گے "

" ہمیشہ سے دھن ' دھن دھڑکے جانے والی زندگی کو ' چاہے ستر سال میں ایک بار ہی سہی ہم بھی اپنی نبضوں میں پوری شدت اور رفتار سے دھڑکتا ہوا دیکھ لیں گے

" پہلے زندگی ہمیں جیتی رہی ہے ۔ اب ہم زندگی کو جئیں گے ۔ "

" کھی ' کھی ' کھی ' ہاتھ تو ملاؤ یارو " مظفر نے کہا ۔

کرسی سے اٹھتے ہوئے حسن نے کہا " یہ ہاتھ ملانے کا نہیں گلے ملنے کا موقع ہے

وہ تین ایسے اپاہج بچوں کی بے ساختگی اور بھولپن سے پورے کمرے میں اچھلتے ' کودتے پھر رہے تھے جیسے ان کے تصورات میں بسے کھلونے آسمان سے گر پڑے ہوں ان کے چہرے یوں دمک رہے تھے جیسے روشن نے چوم چوم کر دمکا دیئے ہوں ۔ وہ لپٹ لپٹ کر مل رہے تھے اور مل مل کے لپٹ رہے تھے ۔

حسن نے کہا " کمال جلدی جلدی پورا پلان بتادو ۔ ہم سے اب اور زیادہ صبر نہیں ہو سکتا۔"

مظفر بولا " رات ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے ۔ وقت گھٹتا چلا جا رہا ہے اور ہم نے رات ہی رات میں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے ۔"

" کار اس کے گھر سے تقریباً سو گز ادھر کھڑی کریں گے ۔ تم کار میں بیٹھے رہنا ' میں اور مظفر ان کے لان کے کونے میں جو درختوں کا جھنڈ ہے وہاں چھپ کر بیٹھ رہیں گے ۔ روشن تو رات میں دیر تک پڑھتی رہتی ہے ۔ جب باقی گھر کی روشنیاں بند ہو جائیں گی تو میں اور مظفر درختوں کے جھنڈ سے نکل کر دبے پاؤں آہستہ آہستہ ' نہایت احتیاط سے پورچ کے پاس پہنچیں گے ۔ پھر میں مظفر کے کندھوں پر کھڑا ہو کر پورچ کا چھجہ پکڑ کر اس کی چھت پر پہنچ جاؤں گا ۔ اس کے بعد مظفر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اوپر کھینچ لوں گا پورچ کی چھت کے ساتھ ہی ذرا اونچا روشن دان ہے ' اس کے چھجے پر چڑھ جائیں گے اور پھر چھلانگ لگا کر دوسرے روشن دان کے چھجے پر چلے جائیں گے اور وہ روشن کی کھڑکی کے بالکل نیچے ہے ۔ میں مظفر کے کندھوں پر کھڑا ہو کر کھڑکی کو ہولے ہولے کھٹکھٹاؤں گا ۔ وہ پوچھے گی کون ' میں کہوں گا تیرا کمال اڑن کھٹولا لے کر تجھے لینے آگیا ہے ۔ وہ جھٹ سے آکر کھڑکی کھولے گی ۔ میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر ایک بھرپور بوسہ لوں گا ۔ پھر ہم تینوں سیڑھیاں اتر کر اندر کے صحن کا دروازہ کھول کر باہر آجائیں گے ۔ پہلے مظفر بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پھاٹک کے پاس باڑ میں جا کر بیٹھ جائے گا ۔ پھر میں روشن کی بغل میں ہاتھ ڈال کر ' اسے سہارا دیتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلا کر لاؤں گا ۔ بھئی سہارا تو دینا ہی ہو گا ۔ وہ بیچاری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑنے کے غم میں نڈھال ہو رہی ہو گی ۔ اس کا خوبصورت سر میرے شانے پر ٹکا ہو گا اسے لا کر مظفر کے پاس باڑ

میں بٹھا دوں گا ۔ پھر پھاٹک سے نکل کر تمہیں ہاتھ سے اشارہ کروں گا ۔ تم بتیاں بند کئے بالکل معمولی رفتار سے گاڑی لے کر آنا تاکہ زیادہ شور نہ ہو ۔ ہاں ! ایک بات اور ، تم اس تمام وقفے کے دوران گاڑی سٹارٹ رکھنا ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت جلدی میں گاڑی سٹارٹ نہ ہو سکے اور تمام محنت اکارت جائے ۔ سب سے پہلے روشن پچھلی سیٹ پر بیٹھے گی پھر اس کے پہلو سے پہلو لگا کر ساتھ میں بیٹھوں گا ۔ تمہارے برابر اگلی سیٹ پر مظفر بیٹھ جائے گا اور ہم روانہ ہو جائیں گے ۔ کہو کیسا پلان ہے ؟"

حسن بولا " بالکل غلط ، سب سے پہلے تو اس پلان کا کوئی نام ہونا چاہئے ، جیسے ٹرپل کراؤن یا کوئی اور ایسا ہی خوبصورت سا نام ۔ یہ بہت ضروری ہوتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ اس پلان کا کوئی انچارج ہونا چاہئے ، جسے کمانڈر کہا جائے گا کیونکہ بغیر کمانڈر کے کوئی آپریشن کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ تیسرے یہ کہ تمہارا پورا پلان فرنٹل اٹیک ہے اس میں نقصان زیادہ ہوتا ہے ۔ چوتھے یہ کہ جب دو جوان پورچ کی چھت پر اور روشندانوں کے چھجوں پر گھومیں گے تو چلتی سڑک پر گزرنے والوں کو نظر آجائے گا ، پانچویں یہ کہ ...."

کمال نے سمجھاتے ہوئے کہا " حسن ! ہر مہم میں خطرے کا کوئی نہ کوئی پہلو تو ہوتا ہی ہے اور اگر اس کو مول لئے بغیر چارہ نہ ہو تو مجبوری ہے ۔ پلان تو ترک نہیں کیا جا سکتا ۔"

حسن نے بھنویں سکیڑ کر کہا " ابھی ہماری بات مکمل نہیں ہوئی ۔ تم چپ چپ رہو ۔ پانچویں یہ کہ کتے کا کوئی حل تم نے نہیں دیا ۔ چھٹے یہ کہ چوکیدار کو کیسے ایمبش کرنا ہے ۔ ساتویں یہ کہ روشن کی کھڑکی کے نیچے کوئی روشن دان نہیں جس کے چھجے پر جوان کھڑے ہوں گے ۔ آٹھویں تم نے یہ نہیں بتایا کہ روشن کو لے کر گاڑی کو کہاں ، کب اور کس راستے سے پہنچنا ہے ۔"

" حسن خدا کے لئے کرنیلی سے پیچھے آؤ ۔ تم کہاں پھنس گئے ہو ۔ ہمارے ارمانوں کا کیوں اس طرح خون کرنے پر تلے ہو ۔"

" ایسے کام کے لئے کرنل نہیں سکنڈ لیفٹیننٹ کافی ہوتا ہے ۔ ڈرو مت سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ اب سے میں اس آپریشن کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں ۔ مظفر ! تم انجنیئر ہو ، کل بھیس بدل کر روشن کے بنگلے کو دیکھ کر آؤ اور اس کا نقشہ بنا کر

پیش کرو ۔ میں نقشے پر سرخ نشانوں سے دکھاؤں گا کہ کس راستے سے اندر جانا ہے اور کس راستے سے روشن کو لے کر باہر نکلنا ہے ۔"

مظفر نے کمال کو سمجھاتے ہوئے کہا " یار حسن ٹھیک کہہ رہا ہے ۔ میں کل جاؤں گا اور بنگلہ دیکھ کر دو چار روز میں نقشہ بنا دوں گا ۔ پھر ایک پورا اور مکمل منصوبہ بنا کر یہ کام کریں گے ۔ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے ۔"

جس کا ڈر تھا وہی ہو کر رہا ۔ تمہاری عمریں واپس آکر پھر آگے کی طرف بڑھنی شروع ہو گئی ہیں ۔ مجھے یہ کام اب تم دونوں کی مدد کے بغیر کرنا ہو گا اور ابھی کرنا ہو گا کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر میں نے ذرا سی بھی سستی کی تو تمہاری طرح میں بھی عمر کو قابو میں نہ رکھ سکوں گا ۔ یہ لمحہ اگر میں نے کھو دیا تو تاسف کا کوئی آپریشن کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ تیسرے یہ کہ تمہارا پورا پلان فرن ٹل اٹیک ہے اس میں نقصان زیادہ ہوتا ہے ۔ چوتھے یہ کہ جب دو جوان پورچ کی چھت پر اور روشندانوں کے چھجوں پر گھومیں گے تو چلتی سڑک پر گزرنے والوں کو نظر آجائے گا ' پانچویں یہ کہ ......"

کمال نے سمجھاتے ہوئے کہا " حسن ! ہر مہم میں خطرے کا کوئی نہ کوئی پہلو تو ہوتا ہی ہے اور اگر اس کو مول لئے بغیر چارہ نہ ہو تو مجبوری ہے ۔ پلان تو ترک نہیں کیا جا سکتا ۔"

حسن نے بھنویں سکیڑ کر کہا " ابھی ہماری بات مکمل نہیں ہوئی ۔ تم چپ چپ رہو ۔ پانچویں یہ کہ کتے کا کوئی حل تم نے نہیں دیا ۔ چھٹے یہ کہ چوکیدار کو کیسے ایمبش کرنا ہے ۔ ساتویں یہ کہ روشن کی کھڑکی کے نیچے کوئی روشن دان نہیں جس کے چھجے پر جوان کھڑے ہوں گے ۔ آٹھویں تم نے یہ نہیں بتایا کہ روشن کو لے کر گاڑی کو کہاں ' کب اور کس راستے سے پہنچنا ہے ۔"

" حسن خدا کے لئے کرنیلی سے پیچھے آؤ ۔ تم کہاں پھنس گئے ہو ۔ ہمارے ارمانوں کا کیوں اس طرح خون کرنے پر تلے ہو ۔"

" ایسے کام کے لئے کرنل نہیں سیکنڈ لیفٹیننٹ کافی ہوتا ہے ۔ ڈرو مت سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ اب سے میں اس آپریشن کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں ۔ مظفر ! تم انجنیئر ہو ' کل بھیس بدل کر روشن کے بنگلے کو دیکھ کر آؤ اور اس کا نقشہ بنا کر

پیش کرو۔ میں نقشے پر سرخ نشانوں سے دکھاؤں گا کہ کس راستے سے اندر جانا ہے اور کس راستے سے روشن کو لے کر باہر نکلنا ہے۔"

مظفر نے کمال کو سمجھاتے ہوئے کہا" یار حسن ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں کل جاؤں گا اور بنگلہ دیکھ کر دو چار روز میں نقشہ بنا دوں گا۔ پھر ایک پورا اور مکمل منصوبہ بنا کر یہ کام کریں گے۔ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔"

جس کا ڈر تھا وہی ہو کر رہا۔ تمہاری عمریں واپس آکر پھر آگے کی طرف بڑھنی شروع ہو گئی ہیں۔ مجھے یہ کام اب تم دونوں کی مدد کے بغیر کرنا ہو گا اور ابھی کرنا ہو گا کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر میں نے ذرا سی بھی سستی کی تو تمہاری طرح میں بھی عمر کو قابو میں نہ رکھ سکوں گا۔ یہ لمحہ اگر میں نے کھو دیا تو تاسف کا خنجر اسی طرح میرے جگر میں گڑا رہے گا جس طرح آج تک گڑا ہوا ہے۔ میں اس سنہری موقع کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا۔ مجھے ایک آخری کوشش کرکے دیکھنا ہے شاید آج ایک رات کے لئے میں اس پھسلتی ہوئی عمر کو قابو میں رکھ سکوں۔ اچھا میں جا رہا ہوں۔ خدا حافظ!"

"کمال کہاں جا رہے ہو"

"انھیں درختوں کے جھنڈ میں"

"اب؟"

ہاں 'اب' جب اور تب میں کیا فرق ہے؟

بدلتے قالب

صفیہ نے ' سیمنٹ کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ' ٹھنڈی تیز ہوا سے سنبھال کے ' اپنے اردگرد اوڑھنی لپیٹی اور دونوں ہاتھوں سے کتابیں سینے پر بھینچ کر قدم تیز کر دیئے کہ اگر پہلی بس نکل گئی تو آدھ پون گھنٹے تک لوگوں کی تیکھی ' ٹٹولنے بلکہ پورے بدن کو کھنگالنے والی نظروں کی تاب کون لائے گا۔ بس سٹاپ پر ہر وقت موجود ' سوکھے پتے جیسی بوڑھی فقیرنی پلٹ پلٹ کر الگ جان کو آتی رہے گی۔ ایک بار انکار سن کر اسے صبر کیوں نہیں آجاتا؟ ایک سرے سے جو مانگنا شروع کرتی ہے تو ایک ایک مسافر سے ' اپنے بغیر دانتوں کے کچے گوشت جیسے لال لال غلیظ مسوڑھے نکال نکال کر بھیڑیئے جیسی تیز ' چالاک آنکھوں میں عاجزی بھر کر ' مانگتی ہوئی آخر تک چلی جائے گی اور دوسرا راؤنڈ پھر اسی شدت اور مستعدی سے شروع کر دے گی۔ وہ دو سال سے اس بس سٹاپ سے کالج کے لئے بس پکڑ رہی تھی اور آج تک ایک پیسہ بڑھیا کو نہیں دیا تھا لیکن وہ ہر روز ' ہر راؤنڈ میں اسی انداز سے متواتر سوال کرتی چلی آرہی تھی " اللہ کے نام پر بیٹی چار آنے بھوکی بڑھیا کو دے دے۔ " رابرٹ بروس کی مثال سے جو سبق اس بوڑھی فقیرنی نے سیکھا ہے آج تک شاید کسی نے نہ سیکھا ہو گا۔

آج بڑھیا کی طرح کے سوکھے ہوئے ' زرد زرد پتوں کے دستے ' کالی چمکدار ' چوڑی سڑک کے ہموار سینے پر جا بجا ' اپنے سوکھے بدن بجاتے کھڑ کھڑ کرتے ' دوڑے پھر رہے تھے ' کبھی آگے ' کبھی پیچھے۔ کسی سادیت پسند ' وحشی آقا کے بے بس لشکری

رات سے گہری کالی گھٹائیں آسمان پر یوں جم کے چھائی تھیں کہ جیسے کبھی ٹل کے نہ دیں گی۔ معمول کی چمکتی، گوری صبح آج شام کی طرح اداس اور سنولائی ہوئی تھی۔ اتنی صبح سڑک ویسے ہی خالی ہوتی تھی لیکن آج تو خاص طور پر کہ کہیں کوئی لپٹا لپٹایا پیدل یا کوئی سکڑا سمٹا اکا دکا سائیکل سوار ہوا کے سامنے اپنے بدن کے ایک ایک ریشے کو بروئے کار لاتا، زور لگاتا، جاتا نظر پڑتا تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں خیال گزرا کہ کم سواریوں کی وجہ سے آج بس کی سواری میں آسانی رہے گی اور سٹاپ پر بوڑھی فقیرنی بھی نہ ہو گی۔

بڑھیا کی غیر موجودگی کا سوچ کر اس کے اندر ایک اطمینان سا تیر گیا۔ اسے نہ معلوم بوڑھی فقیرنی سے خوف کیوں آتا تھا؟ وہ دراصل بڑھیا سے خائف نہیں تھی وہ اس کے بار بار سوال کرنے پر جب بار بار "معاف کرو" کہتی تو اپنی غریبی کا جو احساس ہر بار "معاف کرو" کہنے پر دوہری دھار کے چاقو کی طرح اس کے دل کو پھاڑ کے پھینک دیتا، وہ اس سے خائف تھی۔ کیا اس بڑھیا کے لئے بھرے بازار میں میری غریبی پر سے پردہ اٹھانا ضروری ہے؟ کیا میری امیر ہم سبقوں کی چبھتی ہوئی نظریں اس کام کے لئے کافی نہیں ہیں؟ لے دے کے ایک اٹھنی ہوتی ہے۔ چار آنے کالج جانے کا اور چار آنے واپس آنے کا کرایہ۔ کئی مرتبہ اس نے سوچا کہ ایک چونی اسے دے کر کہے کہ "دیکھو بڑھیا! اب آئندہ کبھی مجھ سے سوال کر کے ندامت کے سمندر میں نہ دھکیلنا، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا جو تمہیں دے سکوں۔" پھر یہ سوچ کر اٹھنی مٹھی میں بھینچ لیتی کہ اگر کالج دیر سے پہنچی تو استادوں اور ہم سبقوں کی شک بھری نظروں کو کیوں کر سہار سکوں گی۔ چند چہرے، جن پر آوارگی کی تہمت ہے، ان پر طمانیت خاطر کی چھاپ دیکھ کر کیسے کہوں گی کہ جو وہ سوچ رہی ہیں، بات وہ نہیں ہے، اگر واپس پیدل جاؤں تو ماں آسمان سر پر اٹھا لے گی کہ کمّی اتنی دیر کہاں رہی اور تعلیم کا سلسلہ جو پہلے ہی ڈانوا ڈول ہے وہیں منقطع ہو کر رہ جائیگا۔ اور پھوپھی کا بیٹا جو ریلوے کے دفتر میں چپراسی ہے اور ہر اتوار کو بالوں میں سرسوں کا تیل ڈال کر ہمارے گھر آ کر بیٹھتا ہے تو جانے کا نام نہیں لیتا، اس سے بیاہ دی جاؤں گی اور اس طرح غریبی کی لعنت ہمیشہ کے لئے میری زندگی کے چہرے پر لکھ دی جائے گی۔ ہزار سوراخوں والا گھسا ہوا سوئٹر جو پہلے میرے باپ کے صاحب نے پہنا پھر میرے باپ

نے کئی سالوں تک پہنا اور اب میں قمیض کے نیچے پہنے ہوئے ہوں کیا اسی طرح پہنے رہوں گی ، کبھی اسے اتار نہیں سکوں گی ؟

دھم دھم کرتی بس اس کے پاس سے گزر گئی ۔ سوکھے ہوئے زرد پتوں کی ایک فوج کی فوج دور تک بس کے پیچھے لپکتی ہوئی جا رہی تھی ۔ سٹاپ اگرچہ ابھی دو ڈھائی فرلانگ دور تھا ۔ مگر اس کے قدم نا دانستہ تیز ہو گئے کمبخت سورج بھی تو آج نہیں نکلا جو وقت کا پتہ چل سکتا ، اسی لئے گھر سے نکلنے میں دیر ہو گئی ۔ سیدھی سڑک پر دور سامنے جاکر بس رکی اور پھر چل دی۔ ہوا اور تیز ہو گئی تھی ۔ آسمان پر پہلے سے کہیں زیادہ سیاہ بادلوں کا ایک ریلا بڑھتا ہوا چلا آرہا تھا ۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے گھیر والے بلند و بالا درخت جنوبی ہوا کے سامنے باؤلے ہوئے اپنے تنوں کے کندھوں پر سوار ادھر ادھر سر پٹخنے لگے تھے ۔ اس کے دل میں ایک انجانا خوف لہرانے لگا ۔ بارش میں بھیگ جانے کا خوف ؟ شاید نہیں ۔ بارش میں اگر بھیگ بھی گئی تو کیا ہو گا ۔ کچھ نہیں ۔ گھر کچھ ایسا دور نہیں وہ بہ آسانی واپس چلی جائے گی ۔ ہراس نے گہرے ہوتے ہوئے کہرے کی طرح آہستہ آہستہ اسے اپنے اندر گم کر لیا وہ کانپنے لگی۔ طوفانی موسم کی وجہ سے ؟ صبح کے وقت شام جیسے اندھیرے پھیل جانے سے ؟ نہیں ۔ ایسا موسم اور سلونا اندھیرا تو دل کو زیادہ سے زیادہ پھول کی طرح نازک لمس والا حزن دے سکتا ہے ، خوف و ہراس کی ٹھوس فضا تو پیدا نہیں کرتا ۔ خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ نہ تو رکی نہ پلٹی بلکہ اسی طرح بس سٹاپ کی طرف آگے بڑھتی رہی ۔ سنسناتی ، شور مچاتی ہوا اس سے گتھ گئی ۔ کپڑے اس کے بدن سے چپک چپک جاتے تھے ۔ اس کے بھرے ہوئے صحت مند جسم کے تمام خطوط و خم نمایاں طور پر ابھر ابھر کے سامنے آتے تھے ۔ سڈول رانیں ، گول مضبوط چھاتیاں ، اندر کو خم کھاتی ہوئی کمر ، باہر کو ابھرتے ہوئے کولھے ، کیا چیز تھی جو ہوا کے ہاتھوں چھپی رہ گئی تھی ۔

وہی جگر جگر چمکتی سفید کار آج بھی اس کے پاس سے گزری ۔ ڈرائیور کے برابر ، تقریباً شوکی کا ہم عمر ، کوئی سات آٹھ برس کا لڑکا جسے روز کار میں ، پاس سے گزرتی دیکھتی تھی ، بیٹھا تھا ، آج اس کی قمیض کا کالر کوٹ سے باہر نکل کر اسکے گلابی گال پر پھڑپھڑا نہیں رہا تھا بلکہ سلیقے سے کوٹ کے اندر بند تھا ۔ وہ سکول جا رہا تھا ۔ کار کے چڑھے ہوئے شیشوں کے پیچھے سے باہر ، اپنی سیاہ ، مائع ، حیرت بھری معصوم آنکھوں

سے دیکھتا ہوا' کچھ ٹٹولتا ہوا۔ اور شوکی اس وقت صرف ایک بٹن کھلی میلی قمیض پہنے' کچے جھونپڑوں کے سامنے غلیظ جوہڑ کے کنارے اپنے ساتھیوں کے ساتھ غلیظ تر گالیوں کا بیوپار کر رہا ہو گا۔ ماں مٹی سے لپی ہوئی اوٹ سے منہ اٹھا اٹھا کر آوازیں دے رہی ہو گی "اے حرامزادے! بکری مر گئی بھوک سے' اسے چرانے کے لئے لے جا"

اس لڑکے کی' تار پر پاس پاس بیٹھے ہوئے دو گم سم سیاہ کبوتروں جیسی آنکھیں دیکھ کر اسے ہر روز یوں محسوس ہوتا جیسے اسے اپنی زندگی میں گزرا ہوا کوئی بہت خوبصورت' پیارا پیارا' مست کر دینے والا بھرپور واقعہ یاد آرہا ہو۔ مگر کبھی کچھ یاد نہ آیا۔ وہ صرف چھاتی پر اوڑھنی درست کر کے رہ جاتی۔ آج بھی ایسا ہی کیا لیکن ہاتھ بہت دیر تک اپنی ہی چھاتیوں کے لمس کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ سرسوں کے تیل میں لبے ہوئے بال' ایسا بیٹا کہاں پیدا کر سکتے ہیں؟ اس نے سوچا کہ غریبی تو ان کے جھونپڑے کے سامنے پھیلے ہوئے غلیظ گندے پانی کے جوہڑ کی طرح ہوتی ہے جس سے بدبو اور تعفن کے سوا کچھ اور ابھر کے نہیں پھیلتا اور جس کے اندر غلاظت کے کیڑوں کے سوا اور کچھ پنپ نہیں سکتا۔ میرا بس چلے تو اس گندے جوہڑ کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے کہیں چلی جاؤں۔

بڑھتے ہوئے سیاہ بادلوں کے ریلے نے اب پورے آسمان پر چھا کر ہر طرف گہری شام بلکہ اوائل رات کے اندھیرے تان دئے تھے۔ ایک ننھی سی بوند اس کی ناک کی پھننگی پر گری' اس نے قدم اور تیز کر دئے۔ دیکھتے دیکھتے بوندوں کی رفتار اچھی خاصی تیز ہو گئی۔ سٹاپ اب قریب ہی تھا۔ وہ دوڑنے لگی اور بھیگتے ہوئے کپڑوں میں دوڑ سے ہانپتی اور ان جانے بھم خوف کی گرفت میں کانپتی بس سٹاپ کے شیڈ میں گھس گئی۔ سامنے بڑھیا کو بیٹھا دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی اور اس کے کھلے ہونٹوں سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ اندھیرے خالی شیڈ کے ایک کونے میں ٹیک لگائے بوڑھی فقیرنی فرش پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ سوکھی ہوئی لکڑی جیسے چہرے پر ابھرتی ناک اور گہری جھریوں کے جال کے پیچھے دور کھوڑوں میں جمی ہوئی' کسی شکار پر جھپٹنے سے پہلے اپنا بدن تولتے ہوئے شکاری جانور کی آنکھوں جیسی تیز' چالاک' بھوکی آنکھیں اسے تاک رہی تھیں۔ شیڈ کی ٹین کی چھت پر بارش کے تھپیڑوں کا بے ہنگم شور کان بہرے

کیئے دے رہا تھا ۔ اس کا بدن جھر جھری لیتے ہوئے تھرا اٹھا اور وہ کنکریٹ کے بنچ پر
بیٹھ گئی ۔ سامنے حد نگاہ تک پانی کی چادریں زمین پر گر رہی تھیں ۔ بڑھیا بلی کی طرح
دبے پاؤں کونے سے اٹھ کر دفعتاً" اس کے سامنے کھڑی تھی ۔ آج وہ بغیر دانتوں کے
'کچے گوشت جیسے لال لال مسوڑھے نہیں نکال رہی تھی اور نہ ہی ایک تار گھورتی
ہوئی خوفناک آنکھوں میں عاجزی کا کوئی شائبہ تھا ۔ صفیہ نے مٹھی کھول کر اس کے
سامنے کر دی ۔ کانپتے ہوئے ہاتھ کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کے وسط میں اٹھنی چمک رہی تھی
وہ ممیائی "بوڑھی ماں ! یہ لے لو میرے پاس دینے کے لئے اور کچھ نہیں" بڑھیا
نے صدیوں سے مری ہوئی کسی لاش جیسا پنجہ آگے بڑھا کے اٹھنی کو اس کی پھیلی ہوئی
ہتھیلی میں بند کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پیچھے دھکیل دیا اور بھیڑیئے جیسی گول بھوری
بھوری آنکھیں جن سے سانپ کی زبان کی طرح کے شعلے صفیہ کے چہرے کی طرف
لپک رہے تھے ' اس پہ گاڑ دیں اور ایسی بھاری بھر کم مردانہ آواز میں بولنے لگی جو
اس نے پہلے کبھی بڑھیا سے تو کیا کسی مرد کے منہ سے بھی نکلتی کم ہی سنی تھی "ہونہہ
! میرے پاس دینے کے لئے اور کچھ نہیں ' لیکن اس بھرے پرے ' بارونق شہر کی
طرح آباد بدن کے بارے میں کیا خیال ہے ؟" بڑھیا نے کیکڑے کی ٹانگ جیسی انگلی
اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا ۔

صفیہ کو اس طرح گھن آئی جیسے کوئی چھپکلی اس کی ٹھوڑی کے نیچے پنجے جما کر
چپک گئی ہو مگر وہ خوف سے خاموش تھی اور اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہے جا
رہے تھے ۔ بڑھیا کہنے لگی "بول میں کیا پوچھ رہی ہوں ؟ جواب دے ۔ تیرا اپنے جسم
کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ آج میرا سوال ہے کہ اسے میرے جسم سے بدل لے
اور میں جواب میں" معاف کرو "نہیں سنوں گی ۔ سمجھی" ۔

اس نے تڑک سے اس طرح آنکھیں کھول دیں جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھتے
ہوئے گھبرا کے جاگ اٹھے ۔ وہ روتے ہوئے بولی "نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا"

بڑھیا بڑے اعتماد سے بولی "یہ ہو سکتا ہے ۔ میں کر سکتی ہوں اور ابھی تجھے
کرکے دکھاؤں گی کہ تیری روح میرے بوڑھے بدن میں منتقل ہو جائے گی اور میری
روح تیرے جوان قالب میں بس جائے گی"

صفیہ کے ذہن میں طرح طرح کے سنے سنائے قصے گھوم گئے ۔ ایسے قصے جہاں

جن نوجوان لڑکی پر عاشق ہو کر اس کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے اور اس پر قبضہ جما کر اپنی آواز میں اس سے باتیں کرواتا ہے' فحش گالیاں بکواتا ہے' لوگوں کو پٹواتا ہے اور جیسے جی چاہتا ہے اس سے حرکتیں کرواتا ہے۔ مقبوضہ جسم یوں بیباکانہ اکڑ کے چلتا' دیواریں پھلانگتا' کودتا' ناچتا پھرتا ہے جیسے وہ خود جن ہو۔ جب وہ جن جسم خالی کر کے چلا جاتا ہے اور اصل مالکہ اس میں واپس آجاتی ہے تو وہی جسم پھر شرم و حیا لئے اپنا آپ سنبھال کے احتیاط سے چلتا ہے۔ پرانے انداز میں آنکھیں نیچی کئے کسی سے تو تکار تو کیا زیادہ بات نہیں کرتا۔ اسے جوگیوں کی کہانیاں یاد آئیں جن کے مطابق جوگی رات کے وقت جنگل میں اپنے جسم کو پور پور بکھیر کر خود سورگ یا نرک کی سیر کو نکل جاتا ہے اور صبح ہونے سے پہلے واپس آکر جسم کو اکٹھا کر کے پھر اس میں مقیم ہو جاتا ہے۔ بھوت پریت کے وہ قصے یاد آئے جہاں وہ لاش میں گھس کر اپنی منشا کے مطابق اس سے زندوں دل کی طرح حرکات کراتے رہتے ہیں اور جب جی بھر جاتا ہے تو اسے خالی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور مٹی کی ڈھیری لاش پھر مٹی کی ڈھیری بن جاتی ہے۔ اس نے یہ کبھی نہ سنا تھا کہ دو روحیں بیک وقت اپنے اپنے جسموں کو خالی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے جسم میں پہنچ جائیں۔ پھر اس نے سوچا یہ بڑھیا بڑی کٹنی ہے۔ جادو گرنی ہے یقیناً" ایسا کرنے کی قدرت رکھتی ہو گی وہ بے اختیار بلک بلک کر بڑھیا سے التجا کرنے لگی "بوڑھی ماں! خدا کے واسطے مجھ پر یہ ظلم نہ کرو میں مر جاؤں گی"

بڑھیا کمر پہ ہاتھ رکھے اس کے سامنے اکڑ کے کھڑی تھی۔ خاموش جیسے بت ہو اس کی التجاؤں سے بے نیاز جیسے پتھر ہو بھیڑیئے کی سی بھوری آنکھیں اس کے چہرے پر یوں گڑی تھیں جیسے اژدہا چوہے کے جسم میں دانت گھونپنے سے پہلے اسے اپنی ساحرانہ نظروں سے آہستہ آہستہ بے دست و پا کرتا چلا جا رہا ہو جیسے جالے میں پھنسی چیختی چلاتی مکھی کو' الگ کھڑی مکڑی چیخنے دیتی ہے' جب وہ تھک کے بے حال ہو جاتی ہے تو اسے اٹھا کر نگل لیتی ہے۔ صفیہ نے جالے میں پھنسی مکھی کی طرح ایک بار اپنی فریاد کی لے بدل کے دیکھی "خدا کے لئے کچھ تو انصاف کرو۔ جو جسم تمہیں ملا تھا اسے تم اچھی طرح استعمال کر چکی ہو۔ ہر لذت جو وہ تمہیں مہیا کر سکتا تھا کر چکا ہے۔ ہر غم اور دکھ جو تم نے سہا وہ اسے گھساتا' کمزور کرتا' اس کی صلاحیت کو

داغدار کرتا اپنا گہرا تاثر چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اب ' جب یہ تھک گیا ہے۔ اس کی حسیات کند ہوتے ہوتے تقریباً مر چکی ہیں۔ اب جب یہ ہر جذبے ' ہر ہیجان کو قبول کرنے سے عاری ہو چکا ہے اور صرف دو وقت کھانے کا تمنائی ہے تاکہ محض زندہ رہ سکے ' ان درختوں کی طرح ' سامنے والی گھاس کی طرح۔ اس کے اعصاب میں کسی بھی لذت کے کسب کی طاقت نہیں رہی۔ اس کی ذہنی بالیدگی جو کچھ بھی ہو سکتی تھی ' اپنی انتہا کو پہنچ کر اب انحطاط کی آخری سیڑھی تک پہنچ چکی ہے۔ حتیٰ کہ اس میں اور زیادہ زندہ رہنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تو تم اسے میرے سر منڈھ رہی ہو۔ اور بدلے میں میرا نیا نویلا بدن ہتھیانا چاہتی ہو جو ابھی تک زندگی کی رنگا رنگ اور پراسرار لذتوں کو دور سے محض ایک تماشائی کی طرح دیکھتا رہا ہے ان سے متعارف بھی نہیں ہوا ہے۔ میری تمام حسرتیں اور تمنائیں ' میرے بلند و بالا عزائم اس جسم کے بغیر سب خاک میں مل جائیں گے۔ کیا میں اور میرے گھر والے ہمیشہ غریبی کے گندے جوہڑ میں پڑے رہیں گے؟ وہ خوبصورت آنکھوں والا بیٹا اس بوڑھی کوکھ سے کیونکر پیدا ہو گا؟ میری تعلیم ختم ہو جائے گی۔ میری ذہنی بالیدگی رک جائے گی

بڑھیا بیتاب ہو کر بولی او بیوقوف لڑکی سن! ہم عورتوں کا کوئی ذہن نہیں ہوتا ' ہمارا فقط جسم ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ذہنی بالیدگی وغیرہ کی بات بھول جا۔ پھر وہ جو تو بوڑھے جسم کو مردہ جسم کے برابر گردان رہی ہے وہ بھی غلط ہے۔ اب تجھ سے کیا بحث کروں۔ جب تو اس بوڑھے جسم میں آئے گی تو تجھے خود بخود پتہ چل جائے گا کہ بڑھاپا زندگی ہی کی ایک سٹیج ہے جیسے بچپن اور جوانی۔ اس کی اپنی لذتیں ہیں ' اپنی خوبیاں ہیں ' اپنی حسرتیں ' تمنائیں اور ولولے ہیں۔ اس کے اپنے تقاضے ہیں اور ان تقاضوں کی تکمیل میں اپنا ایک لطف اور اپنا ایک احساس کارکردگی ہے زندگی کی کسی بھی سٹیج میں الجھ کے مت رہ جاؤ بلکہ اپنے آپ کو کلی طور پر زندگی کے سپرد کر دو تو دیکھو گی کہ اس ایک اکائی کی ہر سٹیج کا ایک جداگانہ ذائقہ ہے جس کو دوسرے بدلا نہیں جا سکتا اور ہر ذائقہ اس قابل کہ اس کے تجربے سے گزرا جائے۔ اور اگر نہ گزر سکو ' کسی حادثے کی وجہ سے یا محض تمہاری ضد کی وجہ سے تو سمجھ لو کہ تجربے کے سلسلے میں ایک بہت اہم کڑی کی کمی رہ گئی۔ چلو! جلدی سے اپنے پیارے

جسم کو آخری بار الوداع کہہ لو ابھی جبکہ یہ تمہارا ہے اسے اپنے ارد گرد خوب اچھی طرح محسوس کرلو، ٹٹول لو، دیکھ لو میں اب اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتی کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر یہ اندھیرے چھٹ گئے یا کوئی اور اس شیڈ میں آگیا تو تبدیلی کا عمل نہیں ہو سکے گا"

بارش، بدلہ چکانے کے انداز میں پوری شدت اور قوت سے شیڈ کی چھت پر اندھا دھند کوڑے برسائے جا رہی تھی۔ بڑھیا کو اتنے محکم اور غیر متزلزل ارادے کے ساتھ تبدیلی پر تلا دیکھ کر صفیہ کو سب دلیلیں بھول گئیں۔ اس نے اٹھ کر بڑھیا کے پاؤں پکڑ لئے "بوڑھی ماں! خدا کے واسطے، اسے مجھ سے ابھی نہ چھینو مجھے کچھ مہلت دے دو"

"کتنی مہلت چاہئے تمہیں؟"

صفیہ سوچ میں گم ہو گئی۔ کہیں بڑھیا کی حد سے بہت کم کا مطالبہ نہ کرلے، کہیں اتنا زیادہ نہ مانگ لے کہ وہ چڑ جائے۔ صفیہ ایک گومگو کے عالم میں پھنس گئی۔

بڑھیا نے تقاضہ کیا "بولو جلدی"

"چاہیے تو ایک عمر، مگر میں آئندہ سال ....."

بڑھیا نے ایک فلک شگاف قہقہہ مارا جو زمین کو نگل جانے والی بادلوں کی کڑک میں جا کر شامل ہو گیا۔ بڑھیا قہقہے مارے جارہی تھی، بادل کڑکے جارہا تھا، صفیہ بولے جا رہی تھی "آج کے دن، اسی وقت، اپنے بیٹے کی خوبصورت آنکھوں کو بوسہ دے کر اپنا جسم تمہیں بھینٹ کرنے یہیں آجاؤں گی اچھا! یہ زیادہ ہے تو ایک مہینہ دے دو۔ اچھا! ایک دن ہی دے دو۔ یہ تو زیادہ نہیں، میں کل اسی وقت اپنے ماں باپ بہن بھائیوں سے مل کر یہیں آجاؤں گی"

بڑھیا نے ہنسی سے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر فرش سے اٹھایا اور بینچ پر بٹھا دیا "تو تو اس طرح ڈر رہی ہے جیسے جسم بدل نہیں رہی بلکہ مر رہی ہے"

صفیہ نے سنبھلتے ہوئے پہلی بار قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "میں جسم نہیں بدلوں گی"

بڑھیا نے اپنی شعلہ بار خوفناک آنکھیں اس پر گاڑ دیں "اے لڑکی دیکھ! سن!

اور سمجھ! اگر تو سیدھی طرح نہیں مانے گی تو تبدیلی کے عمل میں تیری روح کو ٹھکانا حاصل کرنے کے لئے شاید یہ بوڑھا جسم بھی نہ مل سکے۔ اس شیڈ میں ' اس بوڑھے جسم کو مردہ پڑا دیکھ کر لوگ سمجھیں گے کہ بوڑھی فقیرنی مر گئی حالانکہ موت تیری واقع ہوئی ہو گی اور اس حقیقت کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو گی" پھر ایک نہایت مکارانہ ہنسی ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی "تجھے اپنے جسم سے بہت پیار ہے کیا؟ اچھا! تیری خاطر میں شام کو تیرے کالج سے واپس آنے کے وقت تک پلٹ آؤں گی اور پھر تیرا جسم تجھے لوٹا دوں گی۔ اب تو ٹھیک ہے نا۔ چلو اب آنکھیں بند کرلو۔ ایک لمحے میں سارا عمل ہو جائے گا۔ گھبراؤ نہیں تمہیں اس میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ قطعی کوئی تکلیف نہیں ہو گی"

صفیہ نے نڈھال ہو کر گرتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگالی اور تھکے تھکے انداز میں بات کرنے لگی جیسے بڑھیا سے مخاطب نہ ہو صرف اپنے آپ سے کہہ رہی ہو "بوڑھی ماں! ان اندھیروں کے چھٹنے میں اور بارش کے تھمنے میں ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ اتنی دیر تک تو مجھے اس بدن میں جی لینے دو۔ اتنی جلدی نہ کرو۔ چند سانس اور اگر اس بدن میں لینے کی مہلت دے دو تو تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ دیکھو میں آخری بار تم سے کہہ رہی ہوں ظلم کا نتیجہ ...."

آسمان سے بجلی گری کہ بڑھیا کی آنکھوں سے کوئی کوندا لپکا ' وہ جو کچھ بھی تھا ' صفیہ کی آنکھیں اس چکا چوند کی تاب نہ لاتی ہوئی مند کے رہ گئیں۔ دوسرے لمحے جب اس جسم نے انگڑائی لیتے ہوئے پلکیں کھولیں تو ابھی تک آنسوؤں سے اسی طرح بھری آنکھیں اب بڑھیا کی آنکھیں بنی جگمگا رہی تھیں۔ ہنسی سے ابل رہی تھیں۔ گال خوشی سے تمتما اٹھے تھے مگر ان پر تازہ آنسوؤں کی لکیریں ابھی تک ویسے ہی چمک رہی تھیں۔ بوڑھا جسم جو اب صفیہ کا تھا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ بڑھیا اپنے جوان جسم کو مست سپنی کی طرح بل دیتی ' بیچ سے لہراتی ہوئی اٹھی گردن کو گھما پھرا کے اس جوان خوبصورت جسم کا جائزہ لیا جو اب اس کا اپنا تھا۔ بند مٹھی کو کھول کر دیکھا تو ہتھیلی کے درمیان میں اٹھنی تھی۔ اسے بوڑھے جسم کی طرف اچھال دیا "اے لڑکی! ہا ہا ہا ' نہیں ' اے بڑھیا! اب تو بڑھیا کہلانے کی تیری باری ہے نا۔ یہ لے اپنی اٹھنی" چھنا کے کی ننھی سے آواز ایک دو بار فرش پر ابھری اور

اٹھنی گھومتی ہوئی شیڈ کی دیوار سے جا اٹکی " اٹھا لے اسے ۔ نہیں اٹھا سکتی میں جانتی ہوں ان گھٹنوں مین بار بار اٹھنے بیٹھنے کی طاقت کہاں رہی ہے چل بیٹھی رہ میں اٹھا دیتی ہوں " یہ کہتے ہوئے اس نے اٹھنی اٹھا کر اس کے سامنے کر دی ۔

صفیہ اپنے پوپلے منہ سے کانپتی ہوئی کمزور آواز میں کہہ رہی تھی " مجھے نہیں چاہیے ' یہ بھی تو ہی رکھ "

بڑھیا بولی " پاگل مت بن مجھے معلوم ہے اس بوڑھے جسم کو اٹھنی تو کیا ایک ایک پیسے کی صورت کو ترسنا پڑتا ہے ۔ رکھ لے کام آئے گی " پھر گورے ترشے ترشائے ' چکنے ہاتھون نے صدیوں سے مری ہوئی کسی لاش کا سوکھا ہوا پنجہ کھول کر اٹھنی اس میں تھماتے ہوئے جوانی سے بڑھاپے کا قرض بیباق کروا دیا ۔ وہ قمیض کو کمر اور کولھوں کے گرد ہاتھ سے تنگ کر کے اوڑھنی کو سینے سے پھسلا کر شیڈ کے اندر چل کے دیکھ رہی تھی اور شکایتاً زیر لب کہہ رہی تھی " اچھا ہے لیکن تو نے اسے کچھ ٹھیک سے سدھایا نہیں ۔ خیر! کوئی بات نہیں ' ہفتے عشرہ میں اسے طاق کردوں گی اور اس کے انگ انگ سے ایسی جنوں خیز ادائیں ٹپکیں گی کہ دیکھنے والے بیچ بازار کے ڈھیر ہو جایا کریں گے " بوڑھے جسم کی بھوکے بھیڑیے جیسی چالاک آنکھیں اب کسی بھیڑ کی بھوری ' سست ' خاموش اور خوفزدہ آنکھوں میں تبدیل ہو چکی تھیں ۔ صفیہ نے بوڑھے جسم کے ' بغیر دانتوں کے لال لال غلیظ مسوڑھے بڑھیا کے بھیک مانگنے کے انداز میں نکالتے ہوئے کہا " بڑھیا! دل بے ایمان نہ کر اپنے وعدے سے نہ پھر تجھے میرا جسم مجھے ' میرے کالج سے واپس آنے کے وقت تک یہیں واپس کرنا ہے ۔ میں منتظر رہوں گی ۔ اور خدارا میرے باحیا جسم کو اپنی فحش اور بے ہودہ حرکات سے گلی گلی رسوا نہ کرنا اور اس کی پاکیزگی اور عصمت کو داغدار نہ کرنا ورنہ میری روح تیرے اس غلیظ بدن کے اندر تڑپ تڑپ کر وہ بد عائیں دے گی کہ تیری کہیں بخشش نہ ہو سکے گی " صفیہ حیران تھی کہ پل بھر پہلے کی میری خاموش سادہ آنکھیں اب کیونکر اتنی شیطنت سے چھلک رہی ہیں کہ مجھ پر ہی جب نگاہ ڈالتی ہیں تو میں خوف سے لرزاں و ترساں سب کچھ بھول جاتی ہوں ۔

بڑھیا کہنے لگی " تم تو بلاوجہ دل چھوٹا کرتی ہو ۔ کسی بھی عورت کا جسم اس کا اپنا تھوڑا ہی ہوتا ہے وہ تو مردوں کی ملکیت ہوتا ہے جو عورتوں کے پاس محض امانت کے

طور پر ہوتا ہے۔ میں آج اسے کسی کے سپرد کردوں گی۔ اور اگر تیرے پاس رہتا تو تو زیادہ سے زیادہ کل اسے کسی کو سونپ دیتی۔ اس لئے جو کل کرنا ہے وہ آج ہی کیوں نہ کرلیا جائے۔ تو مطمئن رہ میں اسے دیکھ 'پاکھ کے کسی جوان امیر مرد کے حوالے کروں گی۔ یہ خود لذت یاب ہو گا اور اسے لذت یاب کرے گا۔ یہی اس کی تقدیر ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں جسم لوٹانے کا ارادہ بدل دیا ہے کہ داغدار بدن تو تجھے قابل قبول نہ ہو گا اس لئے بلاوجہ اسے تجھ پر تھوپنے سے حاصل۔"

صفیہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی کہ بات کرتے میں اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ' جلدی جلدی ہلتے ہوئے ہونٹ' سفید دانتوں کے اندر گلابی تیزی سے حرکت کرتی ہوئی' پتلی سی زبان کتنے پیارے پیارے دل موہ لینے والے ہیں کہ بے ساختہ چوم لینے کو دل چاہتا ہے۔ یہ سب جو کبھی میرے تھے اب کتنی محنت و کاوش سے مجھے' مجھی کے خلاف آدرش دے رہے ہیں۔ صفیہ نے بڑھ کر بینچ سے کتابیں اٹھا کر اپنے ہڈیوں کے پنجر جیسے سینے سے چمٹالیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ تھوڑی دیر رو کے طبیعت ذرا ہلکی ہوئی تو بڑھیا کو مخاطب کرکے بولی "جسم تو محض مٹی کا تودہ ہے ایک بے سمجھ' بے عقل چیز' نہ اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ اس کا اپنا کوئی عمل۔ اس سے جو کچھ کراؤ یہ کرتا رہتا ہے۔ جادو گرنی! تو میرے ہی جسم سے مجھے ایسی باتیں کہلوا رہی ہے جو نہ میرے حق میں اچھی ہیں نہ میرے جسم کے حق میں"

اس کے اپنے ہونٹ اور دانت پرے کھڑے اس پر ہنس رہے تھے۔ صفیہ رنجیدہ ہو گئی۔ اور جوش کی وجہ سے اس کے پوپلے منہ سے بات کرنے کی کوشش میں بھپ بھپ کی آوازیں اس طرح ابھریں کہ اس کے اپنے کانوں کو کوئی بات ٹھیک سے سمجھ میں نہ آسکی۔ بڑھیا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "تت تت' ذرا صبر سے کام لو۔ کیا کہا تم نے؟ میرے پلے تو خاک نہیں پڑا"

صفیہ نے دم لیتے ہوئے ذرا سانس درست کیا اور پھر سے بولنا شروع کیا "بڑھیا جتنا تیرا جی چاہے ہنس لے اور خلاف وعدہ یہ جسم تو مجھے لوٹا بھی نہ۔ لیکن اتنا بتا دے' یہ لوٹا ہوا جسم بھی آخر کب تک تیرا ساتھ دے سکے گا' ایک دن تھک ہار کر یہ بھی اسی طرح مضمحل اور بوسیدہ ہو جائے گا تو پھر اسی طرح تنہا اور اداس رہ جائے گی جیسی اس جسم میں تھی' تو کیوں اپنے آپ کو نہیں سدھاتی کہ تھکتے ہوئے جسم کے

ساتھ ساتھ جسم کی لذت سے اسی طرح بے نیاز ہوتی چلی جائے اور اپنے لئے نئی راہیں اور نئی منزلیں تلاش کر لے جو جسم کی لذتوں سے کہیں بڑھ کر تیرے لئے طمانیت اور سکون کا سبب بن سکیں"۔

"یہی تو میں نے تجھے ابتدا میں کہا تھا کہ عمر کی ہر سٹیج کی اپنی لذتیں ہیں۔ تجھے اب اتفاق سے بوڑھا جسم بھی مل گیا ہے اس لئے آرام سے بیٹھی اپنے لئے طمانیت اور سکون کی نئی راہیں تلاش کرتی رہنا۔ البتہ بھیک مانگنا نہ بھولنا ورنہ یہ بوڑھا جسم زیادہ دیر بھوک کی تاب نہ لا سکے گا اور وہ تمہاری نئی منزلیں اور راہیں وغیرہ ویسی ہی پڑی رہ جائیں گی' میری فکر نہ کرو۔ میں تو ازل سے جوان ہوں اور ابد تک جوان رہوں گی۔ اب کے جسم بدلنے میں کچھ دیر ہو گئی ورنہ میں تو ادھر ڈھلی اور ادھر نیا جامہ پہنا"۔

اتنے میں بارش تھم گئی اور گہرے اندھیرے چھٹنے لگے۔

صفیہ اپنے جوان جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی "یہ جسم میرا ہے۔ اس پر سوائے میرے کسی اور کا حق نہیں ہے۔ تیرے پاس یہ میری امانت ہے۔ میرے پاس جب تھا تو کسی کی امانت نہ تھا اور اب جب تو مجھے لوٹا دے گی تو میرے پاس کسی کی امانت نہ ہو گا۔ یہ میرا جسم ہے' میرا اپنا جسم' میں وہ جو ایک فرد ہوں' دنیا کے ہر فرد سے الگ' اپنی حیثیت میں ایک لاثانی فرد' یہ اس کا جسم ہے' یہ کسی کی حرص و ہوس کی آماجگاہ نہیں' یہ میری اور صرف میری بشری ضرورتوں کی تکمیل کا ایک وسیلہ ہے' تیری ہوس پرستی کا ذریعہ نہیں اور نہ میں اسے بننے دوں گی۔ لاؤ میرا جسم مجھے واپس دے دو بہت ہو چکی"۔

بڑھیا جوان جسم کو پہنے' اٹھلاتی ہوئی' اس کی باتوں پر مسکراتی شیڈ سے نکل کر فٹ پاتھ پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اوڑھنی سر سے کیا سینے سے بھی پھسل کر نیچے آ رہی تھی وہ چھاتی ابھارے تن کے کھڑی تھی کہ اکا دکا راہ گیر پلٹ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور' للچائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے گزر گئے۔ صفیہ اپنے مضمحل' نڈھال بوڑھے بدن کو شیڈ کی دیوار سے سہارا دئے' کتابیں سینے سے چمٹائے اس کے پیچھے کھڑی' اپنے بغیر دانتوں کے غلیظ مسوڑھے نکال نکال کے کہہ رہی تھی "خدا کے واسطے ......"

اتنے میں ویسی ہی جگر جگر کرتی سفید کار' جس میں خوبصورت آنکھوں والا لڑکا ہر

صبح سکول جاتا ' پانی کے چھینٹے اڑاتی وہاں سے گزری ۔ چیں سے بریک لگی اور تھوڑی دور جا کے کار رکی اور الٹے پاؤں واپس آ کر بڑھیا کے پاس کھڑی ہو گئی ۔ جوان آدمی نے اتر کر ذرا جھکتے ہوئے دروازہ پورا کھول دیا اور بڑھیا سے کہا " تشریف رکھیئے " صفیہ نے آواز دی " او بڑھیا ! خدا کے واسطے ' نہ لے جا اسے ان راستوں پر " مرد نے گھوم کر ایک نظر صفیہ کو دیکھا اور مسکرا دیا ۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا " بے چاری آخر پاگل ہو گئی " بڑھیا نے کار میں بیٹھتے ہوئے اپنے جوان ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ پھیلا کر صفیہ سے کہا " اچھا ! لڑکی۔ " مرد نے بلند آواز میں ہنستے ہوئے پیار سے بڑھیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " بڑی شوخ ہو جی تم " ۔

کار کو جاتے دیکھ کر صفیہ اپنی تھکی ہوئی بوڑھی آواز میں پکاری " میں کب تک بیٹھی رہوں کچھ تو بتا جاؤ " اس سوال کا کوئی جواب نہ آیا کار دور چلی جا رہی تھی جسے وہ اپنی بھیڑ جیسی بھوری بھوری آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی ' اس کے خشک لکڑی کے سے چہرے پر حسرت و یاس کے گہرے بادل چھا گئے ۔

وہ کتابیں سینے سے چمٹائے شیڈ کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی ۔ روز کے دیکھنے والے حیران تھے کہ ایک ایک کو مانگ مانگ کر زچ کر دینے والی بوڑھی فقیرنی کو آج کیا ہو گیا ہے کہ یوں منہ چھپائے خاموش بیٹھی ہے ۔ ایک دو نے تو آ کے پوچھا بھی کہ مائی کیا بات ہے ؟ بیمار ہو گیا ؟ مگر صفیہ نے کوئی جواب نہ دیا ۔ چند ایک نے اس کے سامنے پیسے بھی پھینکے جو اس نے نہ اٹھائے ۔ صبح سے شام ہو گئی ' شام سے رات ہو گئی ' رات سے دن ہو گیا مگر وہ اسی طرح پلو میں منہ چھپائے بت بنی بیٹھی رہی ۔ دوسرے دن دوپہر کے قریب پولیس نے آ کر صفیہ سے صفیہ کی کتابیں برآمد کر لیں اور صفیہ کو صفیہ ہی کے اغوا کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی ۔

آنکھ کھلی تو۔۔۔۔۔

آنکھ کھلی تو سفید براق چھت سے بجلی کا پنکھا چپ لٹکا اسے گھور رہا تھا۔ اس کے اوپر سرخ کمبل تھا۔ پلنگ کی پائنتی ' لوہے کے اسٹینڈ کے ساتھ سرخ بوتل الٹی ٹنگی اسے چھت اور سامنے کی دیوار کے مقام اتصال کے برابر اونچی دکھائی پڑتی تھی۔ اس میں سے ایک ربڑ کی پتلی ' لمبی ٹیوب نکل کر نیچے آتے آتے اس کی پائنتی کی طرف سے اس کے کمبل میں گھسی تھی۔ کیا خبر کہ کمبل اس سے سرخ تھا یا کمبل کی سرخی چوس چوس کر بوتل سرخ ہو رہی تھی۔

" یا اللہ ! میں کہاں ہوں ؟ میری چھت پر تو ٹیڑھی سیاہ کڑیاں اور ان میں جھانکتا ہوا ' بھونسلا ' بھونسلا سا دھواں زدہ گھاس پھونس ہوتا تھا۔ اتنی اجلی چھت اور پھر بجلی کا پنکھا ! میلے چیکٹ لحاف کی جگہ صاف ستھرا سرخ کمبل ؟ یہ سب کیا ہے ؟ "

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بائیں طرف لوہے کے سیاہ پلنگوں کی ایک لمبی قطار تھی اور ان میں سے ہر ایک پر سرخ کمبل کے پھیلے ہوئے ڈھیر میں پھنسا ہوا ایک سر تھا۔ دائیں طرف چھت سے فرش تک پہنچتی شیشے کی کھڑکی تھی۔ باہر گدلے گدلے آسمان کا الٹا پیالہ اور ویسی ہی میلی میلی دھوپ تاحد نظر پھیلتے چلے گئے تھے اور درمیان میں دو سرخ پتھر کے مینار ایک دوسرے سے اچھے خاصے فاصلے پر معلق تھے۔ ان کی اوپر کی چھتریاں اور کلس سفید تھے۔ اوپر ہی اوپر اٹھے چلے جاتے دونوں مینار جو ایک دوسرے سے الگ اور کٹے ہوئے تھے ' ان میں ہم شکلی اور ہم جنسی کے علاوہ بھی کوئی ربط

باہمی تھا۔ شاید اس مٹیالے ماحول سے نکل کر بلند ہوتے ہوتے آسمانوں سے پار نکل کر نورانی فضاؤں میں ضم ہو جانے کی ایک بے جگری سے کی جانے والی آخری کوشش ان میں مشترک تھی - اس نے ذرا سی گردن اٹھا کر دیکھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بھی بائیں طرف کو سیاہ پلنگوں پر سرخ کمبلوں میں پھنسے ہوئے سروں کی قطار بڑھتی چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کھلے رہنے کی سکت نہ رہی، پھر بند ہو گئیں۔ اسے پتہ تھا کہ اس کا منہ کھلا ہے لیکن بند کرنے کی تاب کہاں تھی۔ اس نے فیصلہ دیا "چلو! کھلا رہے"۔

پھر وہی خیال گزرا "میں کہاں ہوں؟"

"میں کہیں بھی ہوں لیکن تا حال میں وہی "میں" ہوں اور میرے اندر کے سینکڑوں 'میں' رسی میں بندھے لکڑیوں کے گٹھے کی طرح یکجا ہیں اور ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ گٹھا بکھر جائے اور ان میں سے ہر ایک 'میں' الگ الگ جا کھڑا ہو اور اصلی "میں" کہیں ڈھونڈے سے نہ ملے"۔ پھر آنکھ کھلی تو سامنے الٹی ٹنگی سرخ بوتل تقریباً خالی تھی۔ صرف پیندے میں ابھی کچھ سرخ مائع اٹکا تھا۔ منہ ایسے کڑوا تھا جیسے پتہ نہیں زہر کے کتنے مٹکے پی گیا ہو۔ وہ ایک زمانے سے بیمار چلا آرہا تھا مگر جیسا اب کے بیمار ہوا ویسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ بدن کے ریشے ریشے اور روئیں روئیں سے کسی نے جان سونت لی تھی۔ آٹھ، نو سال پہلے فالج کا حملہ ہوا اور اس کا آدھا جسم مر گیا۔ وہ نیم مردہ بازو کو جھلاتے اور بے کار ٹانگ کو گھسیٹتے ہوئے گھومتا رہا۔ اب ان اعضا میں قدرے سہار پیدا ہوئی تھی تو لرزے سے باری کا بخار آنے لگا۔ بیس پچیس دن تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ پیٹ بھر کھانا تو ملتا نہیں تھا، کون ڈاکٹروں حکیموں کو پیسے دیتا۔ اور پھر وہ دیتا بھی تو کہاں سے دیتا۔ اس نے سوچا تھا کہ ملیریا ہی تو ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ شہر کا کونسا گلی کوچہ ایسا ہے کہ جہاں مچھروں کی فوجوں کی فوجیں دندناتی نہیں پھرتیں اور کمیٹی والے ایسے بے خبر پڑے سوتے ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ یہاں ملیریا نہیں پھیلے گا تو اور کیا ہو گا۔ لوگ بخار میں پڑے پھنکتے ہیں تو پھنکتے رہیں۔ ان کی بلا سے۔ انہیں تو بس اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہوتی ہے۔ البتہ امیروں کی بستیوں کی بات دوسری ہے۔ ہر

طرح کی مچھر مار دوائیں موجود ہوتی ہیں۔ کیا مجال کہ وہ موذی پتنگا اتنا پھل پھول سکے کہ فوجیں بنا کر یلغار کرنے لگے۔ پھر وہاں کسی کو ملیریا ہو بھی جائے تو علاج کی تمام سہولتیں میسر ہوتی ہیں اور ایک دو روز ہی میں بیماری سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ غریبوں کی طرح تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ مہینوں پڑے ایڑیاں رگڑتے رہیں۔ اسے دو دن سے پیشاب نہیں آیا تھا اور نہ اس نے ہی کچھ خیال کیا تھا۔ رات بھر نہایت بے چین رہا۔ صبح کو بھی محض عادتاً بلا حاجت گلی میں پیشاب کے لئے بیٹھا تو بمشکل چلو بھر خون خارج ہوا اور بس۔ اٹھا تو چکرا کے گر گیا۔ آنکھ کھلی تو یہاں تھا۔

دکھ اس پر اس طرح چھا گیا تھا جیسے زندگی میں ایک دن بھی صحت مند نہ رہا ہو اور صدیوں سے بیمار چلا آرہا ہو اور صدیوں تک یونہی بیمار رہ کر مرجائے گا۔ اس کا جی متلانے لگا۔ معدے میں یوں جلن مچی تھی جیسے کسی نے منہ تک انگارے بھر دیئے ہوں۔

"یا الٰہی! گناہوں کی سزا تو آئندہ زندگی میں ملنی ہے۔ وہ کونسا ایسا گناہ ہے جس کی اتنی کڑی سزا مجھے یہیں دی جا رہی ہے"

اس نے دائیں طرف دیکھا۔ مینار صاف طور پر اسے بلند ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے سوچا "اگر میں دوڑ کے جاؤں اور ان کے دامن سے لپٹ سکوں تو میں بھی ان کے ساتھ ہی سفلی کائنات سے نکل کر ان فضاؤں میں پہنچ جاؤں جہاں نور ہی نور ہوتا ہے"

کسی بستر پر کوئی زور زور سے ایسہ ایسہ کی آوازیں لگاتے ہوئے قے کر رہا تھا۔

"اگر مجھے بھی قے آجاتی تو میرے اندر کا زہر کچھ تو کم ہوتا اور شاید یوں متلی اور جلن سے کچھ دیر ہی کے لئے سہی، جان چھوٹ جاتی"

دفعتاً" اسے خیال آیا "ہاں! ایک گناہ ایسا ضرور ہے جس کی سزا یہاں بھی دی جاتی ہے اور آئندہ بھی۔ اور وہ ہے کسی ایسی چڑیا کی گردن پر چھری پھیر دینا جو اتنی مانوس ہو گئی ہو کہ ہتھیلی پر سے بے دھڑک آکر دانہ چگتی ہو۔ کھانڈ کی بنی ہوئی گڑیا جیسی سفید، نازک اور میٹھی حرہ جو مجھے اپنا مقدر بنا کے، باپ کے سائے کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں اور محفوظ چار دیواری تج کے، تیز تیکھی دھوپ میں، صرف ایک چادر لئے، راستوں کی دھول پھانکتی، میرے پیچھے پیچھے، منزل در منزل، نظریں نیچی

کئے چلی آئی تھی اس کو میں نے بھرے بازار میں لا کر کھڑا کر دیا اور اس کی چادر نوچ لی۔ بچپن میں کھانڈ کی گڑیا جونہی میرے ہاتھوں میں پہنچتی تو پتہ نہیں کیسے ہربار اس کی گردن کٹک سے ٹوٹ جایا کرتی تھی اور میں ہر بار اپنے آپ کو ملامت کرتا، تاسف کرتا، روتا، لیکن جب اس گڑیا کی گردن میرے ہاتھوں میں آکر مروڑی گئی تو نہ تو میں نے اپنے آپ کو ملامت کی، نہ متاسف ہوا نہ رویا۔ شاید دل پتھر ہو چکا تھا۔ اور یقیناً" دل کا پتھر ہو جانا ہی وہ گناہ ہے جس کی سزا یہاں بھی اور وہاں بھی مل کے رہتی ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ نہ خوف نہ مایوسی، نہ انتقام کی آگ نہ رحم کی اپیل، صرف ایک نیستی کی راکھ تھی جو ان میں افق تا بہ افق اڑتی نظر آرہی تھی۔ اس نے بولی دینے والوں میں سے کسی ایک کی طرف آنکھ اٹھاکے نہیں دیکھا۔ اس کا خاموش چہرہ، پھٹی پڑتی کالی سیاہ آنکھوں سے صرف مجھے دیکھے جا رہا تھا، مسلسل۔۔۔۔۔ لگاتار۔۔۔۔ میں اچھل اچھل کر ایک وارفتگی کے عالم میں ہر نئی بولی کو بلند سے بلند تر آواز میں دہرائے جارہا تھا۔ میں پاگلوں والے جوش میں پکار رہا تھا۔۔۔۔ اور بڑھو، اور بڑھاؤ۔۔۔۔۔ اتنے اچھے مال کی یہ کوئی قیمت نہیں۔

اس کے لب بند تھے، ذہن گویا ماؤف تھا اور آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ ان کھلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے یہ سب کچھ کرتے دیکھے جا رہی تھی۔ بولی ختم ہوئی تو نیستی بھی ان آنکھوں سے چھلک کر مٹی میں جذب ہو گئی اب وہ خالی تھیں، قطعی خالی، کسی مردے کی آنکھوں کی طرح یا میرے ضمیر کی طرح۔ جاتے ہوئے اس نے صرف ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ میں وہی تھا نا! ہاں وہی، جس نے ہتھیلی پر سے دانہ چگنے والی چڑیا کے گلے پر چھری پھیر دی تھی۔ میں سیدھی سڑک پر اسے جہاں تک نظر آتی رہی، جاتے دیکھتا رہا۔ پھر چوک میں لگے فوارے پر کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ لیکن اس نے پھر پلٹ کر نہ دیکھا۔ کیا دیکھتی؟ حرہ چلی گئی، نوٹ آگئے۔ نوٹوں کو گھوڑوں نے کھایا، شراب نے پیا، رنڈیوں نے نوچا۔ یوں پھر نوٹ بھی چلے گئے لیکن حرہ واپس نہ آئی۔

"وہ خوش قسمت قے کئے جا رہے تھا۔ مجھے بھی آجائے تو بدن میں جمع زہر کچھ تو

خارج ہو۔ ایک شراب سے بے حال کو کسی نے مشورہ دیا قے کرو، سنبھل جاؤ گے۔ اس نے کہا کوشش کر چکا، نہیں ہوتی۔ مشورہ دینے والے نے کہا، آئینہ دیکھو فوراً ہو جائے گی۔ میں نے بھی تو ابھی دل کے آئینے میں اپنی کریہہ صورت دیکھی لیکن عذاب ہے کہ ٹلنے میں نہیں آتا۔"

اس کا اتنا سوچنا تھا کہ ایک زور کی ابکائی اٹھی، بدن کی رگ رگ اینٹھ گئی۔ ہرا ہرا کف آلود، نہایت کڑوا مائع اس کے منہ سے نکل کر تکیے پر پھیل گیا اور وہ نقاہت سے آنکھیں کھلی نہ رکھ سکا۔

آنکھ کھلی تو اب سامنے اسٹینڈ پہ سرخ کی بجائے پیازی رنگ کی بوتل ٹنگی تھی۔ اس نے سوچا "اب کوئی سی بھی بوتل ہو کیا فرق پڑتا ہے" اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کوئی اس کے سرہانے کھڑا کسی کو سمجھانے کے انداز میں بتا رہا تھا "جب ملیریا پرانا ہو جائے تو بگڑ کر بلیک واٹر فیور بن جاتا ہے۔ گردے اپنا فعل چھوڑ دیتے ہیں اور پیشاب میں خون آنے لگتا ہے۔ ہم اس مریض کو فلاں فلاں دوائیاں دے رہے ہیں۔ موجودہ حالت میں اگر اس کی قسمت یاوری کرے تو بچ بھی سکتا ہے۔"

"میں جب تک آنکھیں کھول سکتا وہ چار پانچ سفید کوٹوں والے میری طرف پیٹھ کئے لوٹے جا رہے تھے۔ جیسے مردہ دفن کرنے کے بعد لوگ قبر سے ہٹ کر واپس جا رہے ہوتے ہیں۔ میرا جی چاہا کہ آواز دے کر انہیں بتاؤں کہ جب غربت بگڑ جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ پہلے ہی بہت بگڑی ہوئی ہوتی ہے اور جب مچھر گندے پانیوں پر پلتا پلتا پرانا ہو جائے تو اپنے لشکر تیار کرلیتا ہے۔ پھر غربت اور لشکر مل کر وہ اودھم مچاتے ہیں کہ کچھ محفوظ نہیں رہتا۔ اس کھیل میں تو قسمت کے لئے یاوری کرنے کا بھی کوئی موقعہ نہیں ہوتا"۔

اس کے دل میں ہوک سی اٹھی "کاش! اس دم میرا کوئی اپنا یہاں ہوتا تو میرے خشک حلق میں پانی ٹپکاتا۔ مگر ہوتا کون؟ جو بھی قریب آیا اس کو بچھو کی طرح ڈنک مارا۔ آخر ہر کوئی تھک کے الگ ہو گیا۔ جن کو اپنا بنایا تھا وہ کبھی کے کھا پی کے چلتے بنے تھے۔ اس وقت حرہ ہوتی تو سر گود میں رکھ کر تے سے لتھڑے منہ کو صاف کرتی۔ مگر اسے تو میں نے خود گندی لگی ہوئی چیز کی طرح برسوں پہلے قے کرکے اگل دیا تھا اور وہ معاشرے کی ہر دھتکاری ہوئی عورت کی طرح دوسروں کے گناہوں کی

پاداش میں مرنے سے پہلے جنم میں پہنچ چکی تھی اور اب تک تو وہاں سے بھی فارغ ہو کر آگے نکل گئی ہو گی۔ اگرچہ اتنی بہت سی عمر یہاں گزار چکا ہوں مگر لگتا یوں ہے جیسے آج پیدا ہوا تھا یا زیادہ سے زیادہ کل۔ چاہتا ہوں کہ زندہ رہنے کا صرف ایک موقعہ اور مل سکے تو جو جو حماقتیں اور بیوقوفیاں کر کے پہلے زندگی تباہ کی تھی ' اب کے ان سے صاف بچ کر نکل جاؤں گا۔ دوسرا جنم مل جائے تو کیسا رہے ؟ نہیں۔ اس طریقے میں جون کا جھنجھٹ ہوتا ہے۔ میں اگر کبھی کتے کی جون میں ہوں ' تو وہ انسان ہے اور میں انسان ہوں تو وہ تتلی بنی اڑتی پھر رہی ہے۔ پھر پتہ نہیں میں چین ' جاپان میں جا جنم لوں اور وہ کہیں امریکہ ' یورپ میں جا پیدا ہو۔ اس طرح ملاپ ہونے میں نہ جانے کتنے یگ لگ جائیں اور مجھے ایک لمحے کی جدائی کی تاب نہیں"۔

اس کی آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ کندھے پہ گٹھڑی اٹھائے گلی میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا ہے اور حرہ کے باپ نے رخصتی کے وقت جس چادر سے اس کا سر ڈھانپا تھا وہ اسی میں لپٹی اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہے۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے کیسہ ٹٹول کر چابی نکالی اور اسے دیتے ہوئے کہا " لے گھر کی مالکن ! تالہ کھول تا کہ تیرے گھر کی چھت تلے پہنچ کر کچھ آرام پائیں"۔

اس نے چابی لے کر الٹ پلٹ کے دیکھی۔ پھر سر پر ہاتھ لگا کر گھونگھٹ ذرا سا اونچا کیا اور گلابی ہونٹوں سے سفید دانت چمکاتے ہوئے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا " مجھے نہیں پتہ کیسے کھولتے ہیں۔ میں نے کبھی اپنے نگر میں تالہ دیکھا ہی نہیں"۔

اس نے چابی لے کر تالہ کھولا۔ اندر پہنچ کر حرہ نے چادر اتار کر چارپائی پر ڈالتے ہوئے کہا " گاڑی نے تو مجھے چکر چڑھا دئے۔ یہ ہوتی ہے گاڑی ؟ ابھی تک سر میں کھٹ کھٹ کی آواز رچی ہوئی ہے۔ پانی کہاں ہے ؟ " اس نے کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں گھڑے پر الٹا پیالہ پڑا تھا۔ حرہ نے ایک قدم اٹھایا تو اردگرد سے مچھروں کے دل کے دل اڑ پڑے۔ " اوئی اللہ ! اتنے مچھر ؟ یہاں کیسے رہیں گے ؟ یہ تو ہمیں کھا جائیں گے " اس نے پانی پی کر ' چادر اٹھائی اور کمرے کا دروازہ کھول کر صحن میں مچھر نکالنے شروع کر دیئے۔

وہ کہنے لگا " تم مچھروں کی فکر نہ کرو ' ان سے نپٹ لیں گے۔ پمپ اور چھڑکنے

کی دوا لا کر سب کو مار دیں گے۔ اور ہاں! ایک مچھر دانی بھی لے آئیں گے۔ اسے چارپائی کے اردگرد لگالیں تو اندر ایک دانہ نہیں آسکتا۔ بڑے مزے سے سوؤ"۔

وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی جیسے اسے ان باتوں کا یقین نہ ہو پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی "اچھا! وہ سب تو لاتے لاؤ گے لیکن ایک چارپائی تو اور لاؤ۔ کوئی آنے جانے والا دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ دو جنے! اور ایک اکیلی چارپائی"

پھر کیا دیکھتا ہے کہ ایک سہ پہر وہ گھر آیا تو حرہ صحن میں منہ پر دوپٹہ ڈالے پڑی تھی۔ کوئی آٹھ دس دانے مچھروں کے اس کے اوپر ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ اس نے دو تین مرتبہ انہیں اڑایا مگر وہ اپنے پر سمیٹے اسی طرح اپنی اونچی اونچی بیڈھب ٹانگوں پر بیٹھے رہے اتنے میں چاروں طرف سے مچھروں کے پرے کے پرے حرہ کے اوپر آکر بیٹھنے شروع ہو گئے۔ وہ خوف و دہشت کے عالم میں گھبرایا ہوا زور زور سے ہاتھ جھلا جھلا کر اڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن مچھر اپنی جگہ سے سر مو نہ ہٹے۔ حرہ کو چیخ چیخ کر آوازیں دیتا ہے، جھنجوڑتا ہے مگر وہ اسی طرح بے ہوش پڑی سوتی رہتی ہے۔ وہ آٹے کا خالی کنستر لا کر پیٹتا ہے، اخباروں کے کاغذ جلا جلا کر انہیں دھواں دیتا ہے، حرہ کی چادر سے اڑاتا ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عجیب بات تھی کہ مچھر کا ایک دانہ تک اس کی طرف رخ نہیں کرتا لیکن ان کے لشکروں کے لشکر حرہ پہ اترتے جا رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ وقت پر پمپ اور دوا لے آتا تو اب یہ وقت دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اسے یہ خیال بھی گزرا کہ کہیں مچھروں نے اس کی اور حرہ کی اپنے بارے میں گفتگو تو نہ سن لی تھی اور اب انتقامی جذبے کے تحت ان کے کسی قدم اٹھانے سے پہلے ہی حملہ کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے حرہ کا لباس نظر آنا بند ہو گیا۔ پھر اس کے جسم کا خاکہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ جہاں حرہ تھی وہاں اب اسے صرف ایک نیالی، موٹی دل دار تہ بچھی نظر آرہی تھی۔

اتنے میں ان کی بھنبھناہٹ کا شور یوں اٹھا جیسے کوئی ہوائی جہاز اڑنے لگا ہو۔ دفعتاً کیا دیکھتا ہے کہ مچھروں نے حرہ کو چارپائی سے بلند کر لیا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے کوٹھے اور اردگرد کے سب مکانوں سے کہیں زیادہ اونچا اٹھا لیا۔ اس کے بعد وہ اسی طرح لاش کی لاش لیٹی حرہ کو شہر کے مرکز کی طرف اڑائے لئے جانے لگے۔ وہ گلیوں بازاروں میں پاگلوں کی طرح گرتا پڑتا اس کے پیچھے پیچھے دوڑا جا رہا تھا لوگ اس کی

طرف اشارے کر کر کے ہنس رہے تھے ' ٹھٹھے کر رہے تھے ' قہقہے لگا رہے تھے۔ مچھروں نے حرہ کو لے جا کر مینار کی چھتری میں رکھ دیا۔ اسے کچھ اطمینان سا ہوا کیونکہ اسے یقین تھا کہ مینار جو نور کی منزل کا مسافر ہے ' انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے گا۔ لیکن جب وہ ہانپتا ہوا مینار کے نیچے پہنچا تو حیران رہ گیا کیونکہ اس کے چاروں طرف ہر ناکہ مضبوطی سے بند تھا۔ " آخر کیوں ؟ " دفعتاً اس پہ منکشف ہوا کہ پتھر کا مینار جو پتہ نہیں کتنی صدیوں سے وہاں کھڑا تھا اور آج تک اپنی جگہ سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہو سکا تھا ' وہ انصاف کرنے کیلئے کیا حرکت میں آئے گا۔ اسی زمین کی کوکھ سے نکلے پتھروں سے بنا مینار نور کی منزل کا مسافر کیسے ہو سکتا ہے ؟ یہ جب بھی ہلے گا تو نیچے ہی کی طرف گرے گا ' اوپر کہاں جا سکتا ہے۔ وہ نیچے کھڑا ہو کر چیخ پکار کرنے لگا۔ وہاں اس کا واویلا سننے والا کون تھا ؟ البتہ تماشہ دیکھنے والوں کے چاروں طرف ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ تل دھرنے کو کہیں جگہ نہ رہی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ مینار کی چھتری سے حرہ کی شلوار تیز ہوا میں پھڑ پھڑاتی ہوئی اڑتی جا رہی تھی۔ جونہی شلوار اڑی تو دیکھنے والوں نے بو کاٹا ' بو کاٹا کے آسمان تک پہنچنے والے نعرے بلند کئے۔ خوشی سے ناچتے اس جم غفیر اور اچھل اچھل کر نعرے لگاتے اس انبوہ کثیر میں وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے ' زمین پر اپنے گھٹنوں میں سر دئے بیٹھا رونے لگا۔

آنکھ کھلی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ باہر دیکھا تو مینار کہیں اندھیرے میں غرق تھے۔ اس نے سوچا " اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ پہلے بھی کہاں روشن تھے۔ ایک مرتبہ تو کیا اگر ہزار مرتبہ بھی زندگی پھر سے گزارنے کا موقعہ فراہم ہو تو بھی حرہ کسی ایک مرتبہ بھی میرے پاس نہ رہ سکے گی۔ بزدل اور حرہ اکٹھے ہوں تو دونوں ہی برباد ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے آپ سے بچ کر بھلا کہاں جا سکتا ہوں ؟ "

جنگل

یہ کتاب اردو کے مختصر افسانوں کا ایک غیر معمولی اور چونکا دینے والا مجموعہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا مصنف ۔ام اللہ حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ میں فی ،واقع اتنی جدت طرازی، درد مندی او ندرت بیان کو دیکھ کر "جن کی یہ کہانیاں حامل ہیں" مبہوت ہوں اور بے حد خوش بھی!

پڑھنے والے جو اردو مختصر افسانے کی رواجی ساخت اور اس کی یک رنگی سے اکتا کر اسے پڑھنا چھوڑ چکے ہیں، ان کہانیوں کو پڑھ کر خوشگوار طور پر متعجب ہوں گے۔ انہیں اس امر کا احساس ہو گا کہ ایک بالیاقت فنکار ہمیشہ اس اہم ادبی صنف کو ایک نیا موڑ، ایک انوکھا رخ عطا کر سکتا ہے، موضوع و بیان میں ایسے پہلودار، تہ در تہ معانی سمو سکتا ہے جو دیر تک تخیل میں اپنی جولانی قائم رکھتے ہیں۔ انگریزی مثل کے مطابق حلوے کی خوبی کا ثبوت اس کو کھانے میں ہے اور اکرام کی کہانیوں کی اچھائی کو جاننے کے لئے آپ کو ان کہانیوں کو صرف ایک بار پڑھنے کی ضرورت ہے، آپ انہیں دوبارہ پڑھنا چاہیں گے۔

اس تقریباً ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب میں آٹھ افسانے ہیں اور ایک تمثیل۔ "اتم چند" اور "محتاج" ایک طرح سے رواجی مختصر افسانے ہیں، اور پہلا افسانہ ہر لحاظ سے ایک بڑا افسانہ ہے۔ "ایک دوپہر" میں "رم جھم" کی سی شعریت ہے بھگوے بچ۔ آپ اسے مرزا صاحباں کے المناک انجام کی ایک جدید نقش کشی کہہ سکتے ہیں...... یہ ہر اس دیہاتی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے البیلے ماہی کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوتی ہے، اور پھر اپنے باپ اور بھائیوں کے ہاتھوں پکڑے جانے پر ایک معصوم پاکباز بچی بن کر اپنے البیلے سے منہ موڑ لیتی ہے۔ کتنی خوبصورتی ہے اس کہانی میں اور کتنی ان کہی باتیں یہ کہتی ہے؟ "اختلاج" جنسی آگہی کی ایک اول درجے کی کہانی ہے۔ اس رنگ کی بہترین کہانیوں میں ایک؟ "پل اور نقلی چوکیدار" اور "جنگل" دونوں ایک طرح سے تجریدی افسانے ہیں۔ تنہا ہجوم اور تنہا فرد کے المیے؟ ان دونوں میں ایک تیکھی اور دل میں رہ جانے والی صفت ہے ...... اگر تجریدی افسانے اتنے پر تاثیر اور دل آویز ہو سکتے ہیں جتنے یہ دو افسانے، تو میں ان کے لکھے جانے کے خلاف اپنے تعصب سے دست بردار ہونے کو بالکل تیار ہوں۔ "لے گئی پون اڑا" ایک لمبی کہانی ہے... بہت اچھی! "راہ کا پتھر" ایک تمثیل کے روپ میں وارث شاہ کی ہیر کی ایک ایسی سوڈ کا "ایک انوکھا" دم بخود کرنے والا ورشن ہے، جس میں ہیر کا خاوند سیدا ہیرو ہے اور ہماری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہونے لگتی ہیں۔ میری رائے میں یہ ایک شاہکار ہے۔ بڑے تخیل اور انسانی نفسیات کے شعور کے بغیر ایسی تمثیل کوئی سوچ، کوئی لکھ نہیں سکتا۔ آخری کہانی "پکنک" تین دوستوں کے متعلق ایک کہانی ہے جو دریا پر مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں۔ جزئیات نگاری میں بڑی فنی پرکاری اور کاریگری ہے۔ اس میں مزاح کا عنصر ہے...... اور ایک آخری ہولناک تاثر!

میں اس سچے اور بالیاقت فنکار کو سلام کرتا ہوں۔ اس کی آمد اردو مختصر افسانہ کی نمود و ترقی کے لئے نیک فال ہے؟

محمد خالد اختر